وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا
(البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۴۴ شمارہ ۲

شوّال المکرّم۔ ذُوالحجّہ ۱۴۴۶ھ اپریل۔ جون ۲۰۲۵ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ــ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہما

مدیر مسئول: ڈاکٹر عارف رشید

مدیر:
ڈاکٹر ابصار احمد

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت:
حافظ عاکف سعید۔ حافظ عاطف وحید
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ۔ مؤمن محمود
پروفیسر حافظ قاسم رضوان

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرِتعاون: 500 روپے، فی شمارہ: 125 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

پروفیسر خورشید احمد: فکری استقامت کا استعارہ	ڈاکٹر ابصار احمد	3

تذکّر و تدبّر

مِلاکُ التأویل (۴۰)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	17

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی و نحوی تشریح	پروفیسر حافظ احمد یارؒ	29

فکر و نظر

جدید اخلاقی بحران کی فکری بنیادیں	ڈاکٹر محمد رشید ارشد	42

فکر و فلسفہ

مبادیٔ علمِ کلام	سعید عبداللطیف فودہ/مکرم محمود	53

تعلیم و تعلّم

مباحثِ عقیدہ (۲۲)	مؤمن محمود	60

کتاب نما

تعارف و تبصرہ	ادارہ	73

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

پروفیسر خورشید احمد: فکری استقامت کا استعارہ

Gone but not forgotten, remarkable man!

ڈاکٹر ابصار احمد

پروفیسر خورشید احمد صاحب کی دارِفانی سے دارِبقا کی طرف کوچ کرنے کی اطلاع سے جہاں ایک طرف طبعی وفطری رنج والم کی کیفیت ہوئی‘ دوسری جانب گزشتہ صدی کی ساٹھ کی دہائی کے اوائل میں ان کے ساتھ فکرِ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے متاثرہ وابستہ کراچی کے دوسرے تحریکی بزرگوں سے تعارف وملاقات کی بہت سی یادیں بھی ذہن کے پردے پر فلم کی طرح چلنے لگیں۔

اسرار بھائی کی ہدایت وراہنمائی کے مطابق جب راقم نے گورنمنٹ کالج‘ منٹگمری (حال ساہی وال) سے اگست ۱۹۶۳ء میں بی اے (فرسٹ ایئر) پاس کر کے فلسفہ میں آنرز اور ماسٹرز کے لیے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو یہ تمام حضرات ایم اے کی ڈگری کے ساتھ اپنے تدریسی کیریئر کے ابتدائی دور میں تھے۔ خورشید صاحب تو شعبہ معاشیات میں غالباً اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے تھے جبکہ ان کے برادرِ اصغر انیس احمد اسلامی تاریخ کے شعبہ میں اسسٹنٹ لیکچرر تھے (یہ کیڈر بھی اُس وقت کراچی یونیورسٹی میں تھا)۔ جناب خرم جاہ مراد کے تین بھائیوں سے ملاقات ہوئی۔ قاسم حسن مراد تو یونیورسٹی ہی کے شعبہ اسلامی تاریخ میں استاد تھے جبکہ مسلم سجاد صاحب اور ان کے سب سے چھوٹے بھائی کے ساتھ اسلامی جمعیت طلبہ کے درس قرآن اور دوسرے اجتماعات میں ملاقات ہوتی رہی‘ جو شہر میں سٹریچن روڈ پر واقع جمعیت کے دفتر میں ہوتے تھے۔ یہ ہمارے قریبی عزیز بھی اس طرح تھے کہ ان کے والد جناب منظور علی مراد میرے والد کے فرسٹ کزن (پھوپھی زاد بھائی) تھے۔ اس کا تذکرہ برادر مکرم اسرار بھائی نے اپنی تحریروں میں بھی کیا ہے۔ ظفر اسحٰق انصاری بھی شعبہ تاریخ میں لیکچرر تھے۔ ان کی شخصیت کو راقم نے اُس وقت بھی پُرکشش اور متاثر کن پایا‘ حالانکہ انہیں ابھی مستقبل میں میک گل (کینیڈا) اور دوسری معروف بیرونی جامعات میں اپنے علمی وتعلیمی کریئر کو polish کرنا تھا۔ مزید یہ کہ انگریزی اور عربی میں شریعہ لاء کی تدریس اور تحقیقی تصنیفات ومقالات کے ذریعے اسلامی تہذیب پر شان دار کام بھی کرنا تھا۔ یوں انہیں یورپ اور امریکہ کے مستشرقین کے ساتھ مثبت ڈائیلاگ کر کے اسلام کی حقانیت ثابت کرنا تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی ظفر آفاق انصاری‘ جن کا تعلق شعبہ نفسیات سے تھا‘ سے تعارف اور تفصیلی ملاقات بہت بعد میں ہوئی۔ پھر کئی بار سیمینارز میں ملنا ہوا‘ جہاں ایک بار لاہور میں منعقدہ ایک ورک شاپ میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی بھی

شریکِ بزم تھے۔ ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری نے امریکہ اور پھر اٹھارہ سال سعودی عرب کی جامعات میں اسلامی قانون کی تدریس کے بعد وطن واپسی پر اسلام آباد میں ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے تین چار بار کسی علمی موضوع پر سیمینار میں شرکت کی دعوت دی تو لاہور سے اسلام آباد پہنچ کر راقم کی ان دونوں بھائیوں سے ملاقات ہوتی رہی۔ گھر پر دعوتِ طعام اور بیسمنٹ میں ظفر اسحٰق انصاری صاحب کی شان دار لائبریری دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ انگلینڈ سے چارلس گائی ایٹن (حسن عبدالحکیم) برادر محترم صدر مرکزی انجمن خُدّام القرآن کی دعوت پر سالانہ محاضراتِ قرآنی کے سلسلے میں چار وقیع خطبات کے لیے لاہور تشریف لائے تو اسرار بھائی کی دعوت پر ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری صاحب اسلام آباد سے مارچ ۱۹۹۲ء میں آخری خطبے کی صدارت کے لیے لاہور آئے اور قرآن آڈیٹوریم میں ازحد علمی گفتگو اور صدارتی کلمات ارشاد فرمائے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ ماضی میں گہرے تعلق اور نظریاتی وابستگی کی وجہ ہی سے تھا۔

خورشید صاحب کے انتقال کی خبر کے فوراً بعد سوشل میڈیا پر ان کے قریبی فعال دینی ساتھیوں کی تعداد کے حوالے سے کئی وی لاگ اور اخبارات کے کالم پڑھنے میں آئے۔ ان میں ۱۹۳۲ء کے اپریل یا چند ماہ آگے پیچھے دنیا میں آنکھ کھولنے والوں کی تعداد تین اور پھر چار بھی گنوائی گئی‘ جو سب ہی مولانا مودودیؒ کی فکر اور جماعت اسلامی کے بیانیے (narrative) سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ جڑ کر متحرک رہے۔ راقم آثم اس سلسلے میں ایک استدراک کی جرأت کر رہا ہے‘ اور وہ یہ کہ کم ازکم کراچی کے قیام کے دوران اسلامی جمعیت طلبہ اور کراچی یونیورسٹی میں شعبہ فلسفہ میں لیکچرر کی حیثیت سے ایک پانچویں صاحب بھی خورشید صاحب کے ساتھیوں میں شامل تھے‘ اور وہ تھے منظور احمد۔ اسرار بھائی کے ذریعے سے ان کے ساتھ تعارف ہوا‘ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ میرے محسن اس اعتبار سے ہیں کہ انہوں نے شعبہ فلسفہ میں داخلہ کروانے اور تین سالہ آنرز کے پروگرام میں ایک سال کا استثناء (exemption) دلوا کر میرا ایڈمشن سیکنڈ ایئر میں کروایا۔ اسی سال ستمبر ۱۹۶۳ء میں جاوید اکبر انصاری شعبہ اکنامکس میں آنرز کے سال اوّل میں داخل ہوئے تھے۔ منظور صاحب اُس وقت باریش تھے اور تحریک اسلامی سے ان کی وابستگی کا یہ عالَم تھا کہ خورشید صاحب نے ماہ نامہ ’’چراغِ راہ‘‘ (جس کے وہ ایڈیٹر تھے) کے جولائی/ اگست ۱۹۵۸ء کے شمارے میں اعلان کیا کہ قارئین کی خدمت میں پرچہ باقاعدگی سے نئے حسن انتظام اور حسنِ ترتیب سے پہنچے گا۔ حسنِ ترتیب کی سلسلہ میں کراچی کے چند نہایت ذی علم‘ جانے بوجھے اور تجربہ کار افراد کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ادارۂ تحریر میں سب سے اوپر منظور احمد اور پھر خود اُن کا اور محمد عزیر کے نام تھے۔

مَیں فلسفہ میں منظور احمد صاحب کا باقاعدہ طالب علم اس لیے نہیں رہا کہ وہ شعبہ میں میرے داخل ہونے کے فوراً بعد ہی لندن روانہ ہوگئے اور وہاں کے بربیک کالج میں ڈاکٹریٹ کے لیے تحقیقی کام شروع کر دیا۔ تین سال بعد وہ ڈاکٹر منظور احمد بن کر کراچی یونیورسٹی واپس آئے تو داڑھی صاف ہوگئی تھی‘ اور ان میں ذہنی وفکری تحولِ عظیم

واقع ہو چکا تھا۔ فرنگیت زدگی‘ عقل وفکر کی تیز روشنی‘ نئے تجربات اور جدیدیت کی فضا سے وہ اس قدر مسحور ہوئے کہ اسلام کو نہایت ترقی پسند سمجھنا اور بنانا شروع کر دیا۔ اپنے کئی مقالات میں یہ فکر پیش کی کہ اجتہاد کے ذریعے سے ہم اسے جمود سے نکال کر حالات کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔ مغرب کی خداناشناس فکر وتہذیب سے مرعوبیت کے زیرِ اثر انہوں نے یہاں تک بھی برملا یہ نامحمود جملہ ارشاد فرمایا کہ: ’’نقل کے پیادے مغرب یا امریکہ کو شکست نہیں دے سکتے۔‘‘ انہوں نے ’’روشنیٔ طبع‘‘ کے تحت اپنا کم وبیش پندرہ سالہ پڑھا ہوا روایتی اسلام بھلا کر جدید لسانیاتی فلسفے اور ہرمینیات (hermeneutics) کے اصولِ تفسیر قرآن پر لاگو کر دیئے‘ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہرمینیات کے اصول اور اسلامی علم تفسیر کے اصول اپنی بنیاد سے اطلاق تک یک سر مختلف ہیں کیونکہ وہ دو متضاد مابعد الطبیعیات سے ماخوذ ہیں۔ کراچی کے سکالر جناب محمد ظفر اقبال نے اپنی مبسوط کتاب ’’اسلام اور جدیدیت کی کشمکش‘‘ میں مدلّل تفصیل اور اطناب کے ساتھ ڈاکٹر منظور صاحب کے افکار کا جائزہ لیا ہے کیونکہ وہ بہت بعد تک کراچی اور پھر اسلام آباد میں اہم مناصب پر فائز رہے اور تجدد پسند گمراہ کن خیالات پیش کرتے رہے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ ان کی پیدائش ۱۹۳۱ء کی ہوگی‘ کیونکہ انہوں نے سکول کی تعلیم (اغلباً میٹرک) کے بعد رام پور کے ایک مدرسے میں بھی سال کے لگ بھگ تعلیم حاصل کی تھی۔ اس طرح وہ اب ۹۴ سال کی عمر کے ساتھ بقید حیات ہیں۔

پروفیسر خورشید صاحب کا صدر میں کوئنز روڈ پر واقع اپنی رہائش گاہ سے کراچی یونیورسٹی پہنچنے کا وی آئی پی انداز بھی میری یادداشت سے محو نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ ۱۹۶۳ء کے اواخر تک وہ ذی علم اور اسلامی اقدار کے حامل ایک باوقار استاد کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی (ڈین‘ فیکلٹی آف آرٹس)‘ پروفیسر ڈاکٹر ایم ایم احمد (صدر‘ شعبہ فلسفہ)‘ خورشید صاحب اور دو ایک مزید اصحاب فاکس ویگن (VW) ڈبے میں تشریف لاتے تھے‘ جو اُس زمانے میں ایک معتبر اور آرام دہ سواری تھی۔ خورشید صاحب کی تالیف ’’اسلامی نظریۂ حیات‘‘ بھی اسی زمانے میں شائع ہو کر پہلی مرتبہ وہیں مطالعے میں آئی‘ جس کو یونیورسٹی میں آنرز کے کورس میں لازمی اسلامیات کے پرچے کے لیے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے نہ صرف تجویز کیا بلکہ پروموٹ بھی کیا۔ یہ کتاب بھی مولانا مودودیؒ کے تصوّرِ دین سے مستفاد عام فہم زبان میں علمی تفاصیل پر مبنی ہے اور طلبہ وطالبات کے ذہن میں فہمِ دین اور عمل وکردار میں اسلامی اقدار کے فروغ کا باعث بنی۔

خورشید صاحب نے اسلامی جمعیت طلبہ سے وابستگی کے دور میں کراچی سے Students' Voice شائع کیا جبکہ اسرار بھائی نے اپنے دوست سید اسلم کے ساتھ مل کر ’’عزم‘‘ نامی پرچہ شائع کیا۔ البتہ خورشید صاحب کی فتوحات مسلسل جاری اور روز افزوں رہیں۔ فوراً بعد ہی وہ Voice of Islam اور پھر ’’چراغِ راہ‘‘ کے ایڈیٹر بنا دیے گئے‘ جن میں ان کے رشحاتِ قلم کا سلسلہ جاری رہا۔ ’’چراغِ راہ‘‘ کے تین ضخیم خصوصی شمارے اپنے محتویات کے اعتبار سے معرکۃ الآراء‘ خورشید صاحب کے ہمہ جہت وسیع مطالعہ اور ادارتی حسن کے آئینہ دار تھے: اسلامی

قانون نمبر (دو جلدیں)‘ نظریہ پاکستان نمبر اور سوشلزم نمبر۔ ۱۹۶۲ء میں جماعت اسلامی کے اعاظم رجال نے کراچی میں علمی و تحقیقی کام کے لیے اسلامی ریسرچ اکیڈمی کی بنیاد رکھی‘ جس کے سرپرست (patron) اور صدر نشین مولانا مودودیؒ اور سیکریٹری جنرل خورشید احمد صاحب مقرر کیے گئے۔ اس ریسرچ اکیڈمی نے بہت سے موضوعات پر کتابیں شائع کیں۔ اسلامی تحریکی کارکنوں میں عالمی حالات اور وقائع کے شعور کی اہمیت اُجاگر کرنے اور اس سلسلے میں مختلف النظر تبصروں سے آگہی کا پروفیسر خورشید صاحب کا جو خیال تھا‘ راقم کی نظر میں وہ یہ ریسرچ اکیڈمی پندرہ روزہ ’’معارف فیچر‘‘ کی اشاعت سے بطریق احسن پورا کر رہی ہے۔ قارئین کو یہ بتانا بھی مفید رہے گا کہ قرآن اکیڈمی لاہور کے استاذ ڈاکٹر رشید ارشد کو بھی کچھ عرصے سے وہاں متعدد موضوعات پر لیکچر کے لیے دعوت دی گئی ہے۔ ریسرچ اکیڈمی کے منتظمین نے بعض اہم تعلیمی‘ تہذیبی‘ تاریخی اور نوآبادیاتی مسائل پر بھی ان سے آن لائن لیکچرز کی درخواست کی‘ جو وہ باقاعدگی سے ہفتہ وار لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے کے discourse کی صورت میں لاہور میں واقع ’’غزالی فورم‘‘ سے کر رہے ہیں۔ پروفیسر خورشید صاحب کے ایما پر لندن سے جناب حاشر فاروقی انگریزی ماہ نامہ Impact شائع کرتے رہے‘ جس میں دنیائے اسلام اور اس سے باہر بھی کلچرل اور سیاسی تبدیلیوں کے پس پردہ حقائق اور نظریاتی مباحث پر بصیرت افروز علمی شذرات پڑھنے میں آتے رہے۔ یہ ۱۹۷۱ء سے ۲۰۰۴ء تک چھپتا رہا‘ لیکن پھر مالی وسائل کی کمی کے باعث اسے بند کرنا پڑا۔

خرم مراد صاحب کے چھوٹے بھائی قاسم حسن مراد ہمیشہ مشرقی روایات کے پیکر چوڑے پائنچوں والے پاجامے اور شیروانی میں ملبوس یونیورسٹی آتے تھے اور انہیں کبھی انگریزی لباس میں نہیں دیکھا گیا۔ بڑے بھائی کے نقش قدم پر وہ بھی پوری طرح جماعت اسلامی کے فکر میں رنگے ہوئے ایک آئیڈیل مسلمان استاد نظر آتے تھے۔ البتہ جب وہ ڈاکٹریٹ کے لیے کینیڈا گئے تو پھر وہیں کے ہو رہے اور خیالات و افکار میں بھی پہلے جیسی اسلامیت اور دین کے حوالے سے سرگرمی مفقود ہوگئی۔ دو ایک بار مختصر قیام کے لیے پاکستان آئے بھی تو ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ شنید ہے کہ انہوں نے بھی ذہنی وفکری طور پر لبرل ہیومن ازم‘ غرب زدگی اور عقلیت پرستی کا رویہ اپنا لیا تھا۔ ترجمان القرآن کے مدیر سلیم منصور خالد صاحب سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ پانچ چھ برس قبل کینیڈا میں انتقال کر گئے تھے اور وہیں پر تدفین ہوئی۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ!

ایک اہم واقعہ جو راقم کبھی نہیں بھلا سکے گا‘ وہ جولائی/اگست ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دگرگوں سیاسی حالات اور الیکشن کی ہماہمی سے بچنے کے لیے اسرار بھائی کی میرے قیام کے دوران انگلستان آمد تھی۔ خورشید صاحب بھی وہیں تھے۔ مجھے جماعت اسلامی سے اسرار بھائی کے علیحدہ ہونے اور بعد کے سالوں میں جماعت کے سینئر ساتھیوں اور طالب علمی کے زمانے میں جمعیت کے احباب اور رفقاء سے تلخ مکالمات اور تحریری بحث وتمحیص کا علم تھا۔ چنانچہ اب مجھے یاد نہیں کہ کس طرح راقم اور برادر مکرم لندن سے ٹرین کے ذریعے برمنگھم پہنچ کر جمعیت کے ایک سینئر سابق رفیق (غالباً ڈاکٹر نسیم صاحب) کے ہاں پہنچے جہاں خورشید صاحب بھی موجود تھے۔ گمان غالب

ہے کہ انہیں اسی ملاقات کے لیے بلایا گیا تھا۔ ماضی میں مولانا مودودیؒ کے افکار سے متاثر اور اقامتِ دین کے لیے بھرپور سعی و جُہد کرنے والے دونوں حضرات پُرتپاک اور گرم جوشی سے ملے۔ ہم تینوں نے چار بیڈ والے ایک بڑے کمرے میں شب بسری کی، اور رات گئے تک ماضی کے دریچوں میں جھانکنے کا عمل جاری رہا، جس کو سن کر مَیں بھی محظوظ ہوتا رہا اور میری معلومات میں اضافہ بھی ہوا۔ میزبان نے بھی بہترین مہمان نوازی کی، اور یوں دو پرانے دینی تحریکی رفقاء عرصے بعد مل کر ازحد خوش ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ اسرار بھائی کی خورشید صاحب سے یہ آخری ملاقات تھی۔ برسوں بعد ۱۹۹۴ء میں امریکہ سے واپسی پر لندن میں چند دن قیام کے دوران ''امپیکٹ'' کے حاشر فاروقی صاحب نے اپنے آفس میں بانی تنظیم اسلامی کا خاصا طویل اور مبسوط انٹرویو ریکارڈ کیا، جس کا انتظام بھی میرے توسط سے ہوا، چونکہ میں جناب حاشر فاروقی سے بیس بائیس سال قبل بھی لندن کے علاقے ''فنس بری پارک'' میں ملتا رہا تھا۔ تاہم، بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر یہ انٹرویو یا اس کا کچھ حصہ بھی ''امپیکٹ'' میں اشاعت پزیر نہ ہو سکا۔

قارئین کرام! اب ہم مختصر طور پر جناب پروفیسر خورشید احمد کا سوانحی خاکہ پیش کرتے ہیں:

۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء کو پیدا ہونے والے پروفیسر خورشید احمد کا نام برصغیر کی اسلامی فکری روایت میں ایک نمایاں اور درخشندہ مقام رکھتا ہے۔ ان کا انتقال صرف ایک فرد کی موت نہیں بلکہ ایک نظریے اور تحریکی فکر کا گہرا نقصان ہے۔ ان کی زندگی بیک وقت ایک مفکّر، معلّم، محقّق، منتظم اور پالیسی ساز کی تھی، جو کہ خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں جب برصغیر میں فکری بیداری کی نئی لہریں اٹھ رہی تھیں، جدید تعلیم یافتہ طبقے میں سے جو ممتاز شخصیات مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی فکر سے متاثر ہوئیں اور خود کو دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا ان میں خورشید احمد آخری شخص تھے جو ۱۳ اپریل ۲۰۲۵ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ڈاکٹر اسرار احمد، محترم نعیم صدیقی، ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری، خرم جاہ مراد اور پروفیسر خورشید احمد جیسے نابغۂ روزگار افراد نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے لٹریچر سے متاثر ہو کر ایک فکری و عملی جدّ و جُہد کا آغاز کیا۔ اسلامی جمعیت طلبہ جیسی منظّم تنظیم سے ان کا رشتہ صرف وقتی یا دنیاوی فائدے کا نہ تھا بلکہ ایک مشن کی صورت میں دین کی سربلندی ان کی زندگی کا محور بن گئی۔

پروفیسر خورشید احمد نے دہلی کے ایک علمی، دینی اور اردو بولنے والے گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم دہلی کے اینگلو عریبک ادارے میں حاصل کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان کا خاندان ہجرت کر کے لاہور آ بسا، جہاں سے انہوں نے ۱۹۴۸ء میں گورنمنٹ کالج میں اکنامکس میں تعلیم کا آغاز کیا ہی تھا کہ نیوی میں بڑے بھائی کی ملازمت کے سلسلے میں یہ خاندان کراچی منتقل ہو گیا، اور پھر ان کے تمام تعلیمی مراحل کراچی میں طے ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں اکنامکس میں فرسٹ کلاس آنرز کے ساتھ بی اے مکمل کیا اور اسی دوران مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے

افکار سے متاثر ہو کر پہلے اسلامی جمعیت طلبہ اور پھر جماعت اسلامی سے وابستگی اختیار کی۔ اسلامی قانون اور فقہ میں دلچسپی کے باعث ایس ایم لاء کالج سے ایل ایل بی بھی کیا۔ بعدازاں کراچی یونیورسٹی سے معاشیات اور اسلامیات میں ایم اے کی اسناد حاصل کیں۔ یونیورسٹی کے شعبہ اکنامکس میں کئی برس تدریسی فرائض انجام دیے۔ پھر ان کی علمی جستجو ۱۹۶۶ء میں انہیں برطانیہ لے گئی' جہاں لیسٹر یونیورسٹی نے ''اسلامی اقتصادیات'' کے موضوع پر ان کی تحاریر کو سراہا۔ اسی یونیورسٹی اور ملائیشیا کی ایک یونیورسٹی نے بھی انہیں تعلیم میں خدمات کے اعتراف پر اعزازی ڈاکٹریٹ سے نوازا۔

پروفیسر صاحب کا میدانِ عمل محض درس وتدریس تک محدود نہ تھا۔ وہ ایک متحرک داعی' منتظم اور ادارہ ساز بھی تھے۔ انہوں نے اسلامی اقتصادیات کے میدان میں جو تحقیقی کام کیا' اسے عالمی سطح پر تسلیم کیا گیا۔ اسی سلسلے میں ۱۹۸۸ء میں انہیں اسلامی ترقیاتی بینک کا اعلیٰ ترین ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۹۰ء میں سعودی حکومت کی جانب سے شاہ فیصل بین الاقوامی ایوارڈ اور ۱۹۹۸ء میں امریکن فنانس ہاؤس کا ''لاربو پرائز'' بھی عطا کیا گیا۔ ۲۳ مارچ ۲۰۱۱ء کو ''نشانِ امتیاز'' سے نوازا گیا' جو کہ قومی سطح پر آپ کی ہمہ جہت خدمات کا اعتراف تھا۔ پروفیسر خورشید احمد نے ۱۹۷۸ء میں وفاقی وزیر برائے منصوبہ بندی وترقی کے طور پر ملکی معاشی پالیسی سازی میں بھی اہم کردار کیا۔ پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ البتہ ان کی اصل پہچان علمی ودینی خدمات ہی رہیں۔

ان کی کاوشوں کے نتیجے میں تین بڑے علمی اداروں یعنی انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز (اسلام آباد)' اسلامک فاؤنڈیشن' لیسٹر (برطانیہ) اور اسلامک مشن' نیروبی (کینیا) کی بنیاد رکھی گئی۔ ان کے علمی ذخیرے میں سو سے زیادہ کتب' مضامین' رپورٹس اور متعدد بین الاقوامی رسائل وجرائد کی ادارت شامل ہیں۔ بطور سینیٹر ۲۲ سالہ پارلیمانی خدمات میں ان کی تقاریر آج بھی اسلامی فکر اور قومی حکمت عملی کے لیے مشعل راہ ہیں۔ وہ متعدد جامعات کے قیام اور ارتقا میں رہنما رہے' اور درجنوں جامعات میں ہزاروں طلبہ نے ان سے براہِ راست علمی استفادہ کیا۔ خرم جاہ مراد کے بعد انہوں نے مولانا مودودیؒ کے ماہ نامہ ''ترجمان القرآن'' کی ادارت سنبھالی۔ ان کے اداریے اور تجزیے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نہ صرف ملکی وعلاقائی بلکہ عالمی حالات کو سمجھنے کا ایک منضبط اور مدلّل فریم ورک فراہم کرتے رہے۔ ان کی تحریروں کا آخری سلسلہ فروری ۲۰۲۵ء کے ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہوا' یعنی وفات سے محض ایک ماہ قبل۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ وہ آخری دَم تک اسلامی فکر ودعوت کی خدمت میں مشغول رہے۔

آج وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی لکھی گئی اَن گنت کتابیں اور تحریریں' تربیت یافتہ اذہان اور قائم کردہ ادارے ان کے مشن کی تابندہ شمع ہیں۔ ان کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ علم' عمل اور اخلاص کا سفر کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ وہ ان شاء اللہ آخرت میں اللہ کی مقبولیت سے سرفراز ہوگا اور ان کی علمی میراث کا تسلسل ایک

لمبے عرصے تک جاری رہے گا:

يَلُوحُ الخطُّ فی القِرطَاسِ دھراً
و کاتبہٗ رَمیمٌ فی الترابِ

(نقش کتابت کاغذ پر مدّتوں قائم ودائم اور تاباں رہے گا جبکہ لکھنے والے کی ہڈیاں خاک میں مل چکی ہوں گی۔)

اور افتخار عارف نے کیا خوب کہا ہے:

ہم اپنے رفتگاں کو یاد رکھنا چاہتے ہیں
دلوں کو درد سے آباد رکھنا چاہتے ہیں

اب میں قارئین کو ''حکمتِ قرآن'' کے جولائی- ستمبر ۲۰۲۳ء کے شمارے میں شائع شدہ اپنی تحریر کی طرف لیے چلتا ہوں، جس میں راقم نے پروفیسر خورشید احمد صاحب کے داماد ڈاکٹر اسامہ حسن کا ذکر کیا تھا۔ موصوف نے انگلستان میں رہتے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہوئے بہترین دینی وعلمی ماحول میں تربیت پائی، لیکن پھر اپنے متواتر ومتوارث دینی روایت اور عقائد سے پسپائی اختیار کی جو از حد حیرت اور حزن و ملال کا باعث بنا۔ لیکن افسوس کہ نہ ان کے والد جناب ڈاکٹر صہیب حسن صاحب اور نہ حلقۂ خورشید میں سے کسی نے اس کا نوٹس لیا اور وضاحت کی زحمت گوارا کی۔ میری یہ تحریر اور اس میں محترم حامد کمال الدین کا استدراک اور انتہائی عمیق تجزیہ ملاحظہ فرمائیے:

> ''اُمّتِ مُسلمہ کے کثیر دانش وَر اور المیہ یہ ہے کہ کچھ تحریک اسلامی کی اعلیٰ قیادت کے قریبی عزیز بھی مغرب کے تہذیب و افکار سے متاثر ہو کر آسمانی ہدایت کو پسِ پشت ڈال رہے ہیں۔ تمدن، اجتماعِ انسانیت اور لیڈر شپ کے بارے میں قرآن وسُنّت سے ملنے والی روشن ہدایت کے مقابلے میں وہ جان لاک، ہابز، روسو اور دوسرے غیر مسلم اور سیکولر لبرل مفکّرین کے خیالات کو فخر کے ساتھ اپنا رہے ہیں۔ یوں سیکولرائزیشن کا عمل تیزی سے عالمی سطح پر اپنے قدم جما رہا ہے۔ اعلانیہ مسلم اکثریتی ریاستوں (confessional Muslim states) کا سیاسی سٹرکچر اور داخلی حکومتی نظام پورے طور پر مغربی لادینی جمہوری اصولوں کے تحت اور سودی معیشت پر مبنی ہے، تاہم کم ازکم اہل سُنّت کے منبر و محراب سے قرآن وسُنّت کی بے آمیز اصولی تعلیمات بیان کی جاتی ہیں، اور دین کو اصالت وصلابت (قرآن وسُنّت اور ورثہ سلف سے تمسّک وکلیت) کے ساتھ سامعین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔
>
> راقم عالَمِ اسلام اور ملّتِ اسلامیہ پر کفر والحاد کے سیلابِ بلاخیز کے بارے میں مطالعہ کر رہا تھا کہ اچانک پچاس (۵۰) صفحات پر مبنی ایک بہت ہی دھماکا خیز تحریر واٹس ایپ پر پی ڈی ایف شکل میں ملی، جس کا عنوان ہے:
>
> *Reclaim Political Islam from the Islamists to Raise Moderate Muslim Voices*

یہ تحریر Tony Blair Institute for Global Change نے جون ۲۰۲۳ء میں جاری کی ہے۔ ٹائٹل پر مصنفین کے دو نام اسامہ حسن اور میتھیو گوڈون دیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر اسامہ حسن راقم کے دوست و استاذ ڈاکٹر مولانا صہیب حسن صاحب کے صاحب زادے ہیں' اور لیسٹر (انگلستان) میں مقیم پروفیسر خورشید احمد صاحب کے داماد ہیں۔

اسامہ حسن کی پیدائش اور پھر ساری تعلیم انگلینڈ میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم ڈاکٹریٹ لیول تک انہوں نے لندن کے امپیریل کالج اور کیمبرج یونیورسٹی سے حاصل کی۔ حافظِ قرآن ہیں اور مساجد میں خطابِ جمعہ اور امامت کرتے رہے ہیں۔ البتہ ٹونی بلیئر (سابق وزیر اعظم برطانیہ) کے ادارے میں راہ و رسم کے بعد جو تحولِ عظیم ان کے افکار میں آیا ہے' وہ انتہائی حیران کن بلکہ تشویش ناک ہے۔ مذکورہ تحریر میں وہ پورے طور پر ''فضائے مغرب'' گزیدہ نظر آتے ہیں۔ موڈریٹ مسلم نقطہ نظر کو اپنانے میں انہوں نے اسلام کے چودہ سو سالوں کے دوران شان دار علمی و فکری کام (جو ہمارے مشاہیر اسلاف نے بہت محنت اور انتہائی گہری اور عمیق نظر کے ساتھ کیا) کو قرونِ وسطیٰ کا فرسودہ اور گھسا پٹا (outdated) فکر کہہ کر رد کر دیا ہے۔ پھر یہ کہ دین کی بنیادی اصطلاحات مانند خلافت' شریعت اور جہاد کو بالکل سیکولر اور compromised انداز میں redefine کیا ہے' جو ایک روایتی عقیدے پر کھڑے مسلمان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

میں یہاں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے مدیر ''ایقاظ'' جناب حامد کمال الدین کے اس خیال کا ذکر کروں گا جو میرے اندازے میں عصرِ حاضر کی گلوبل صورت حال کی صحیح عکاسی کرتا ہے: ''ہمارے اس دَور میں تہذیبوں اور ملتوں کے فرق تیزی کے ساتھ مٹ رہے ہیں' اور ایک یک رنگی انسانیت پراسس میں ہے۔'' جبکہ واقعہ یہ ہے کہ آسمانی ہدایت کو ماننے والے شخص کے لیے یہ قطعاً ممکن نہیں ہے کہ وہ اہلِ ایمان اور اہلِ کفر والحاد کے درمیان binary (فرق و تفاوت) کو کسی طور پر بھی ختم کر سکے۔

جناب حامد کمال الدین نے موجودہ سیاسی و عمرانی مسائل کے ضمن میں امام ابن تیمیہؒ کے مجموع الفتاویٰ میں سے خلافت و ملوکیت سے متعلق فصول کا بہت گہرا مطالعہ اور حواشی و تعلیقات کے ساتھ اردو ترجمہ کیا ہے۔ ''خلافت و ملوکیت'' کے عنوان سے کتاب کے آغاز میں عرضِ مترجم کے تحت انہوں نے دقتِ نظر سے بعض اہم اور قیمتی افکار پیش کیے ہیں' جو قارئین کے نظر و مطالعہ کے لیے من و عن نقل کیے جا رہے ہیں۔ میری دانست میں انہوں نے گلوبلائزیشن اور اس کے dynamics کی صحیح نباضی کرتے ہوئے تحریک اسلامی اور احیائے ملت کے کارکنوں کو بہت سنجیدہ اور وقیع رہنمائی دی ہے۔ وہ ایک خلاق ذہن کے ساتھ genuine inspirer ہیں' اور محض cultist نہیں ہیں:

''ان فصول میں ہماری دلچسپی کی ایک خاص وجہ: ابن تیمیہؒ کے یہ مقالات اسلام کے تصوّرِ اجتماع کو ایک اعلیٰ ضبط دینے میں مفید ہیں۔ ہماری دانست میں اصحابِ نظر اس سے ایک ''پیراڈائم شفٹ'' کی بنیاد پا سکتے ہیں۔ ''اجتماع'' کے وہ تصورات جنہیں الحاد پر کھڑی ایک تہذیب نے اپنی تعلیم و تحقیق کی heavy industry کے ذریعے آج ''بدیہات'' کا رنگ دے ڈالا ہے' دورِ آخر کا ایک واقعہ ہیں' جس سے ماضی میں ہمیں واسطہ نہیں پڑا؛ پس یہ تو ممکن نہیں کہ ان (ہیومن اسٹ) ''بدیہات'' کے بطلان پر متقدمین سے کوئی باقاعدہ مواد لائیں۔ یہ کام تو ان معاصر عقول کے سر رہا جنہیں ''سُنّت و جماعت''

کے اوزاروں پر دسترس ہو۔ ابن تیمیہؒ کے یہاں' بس بعض جگہوں پر ہمیں کچھ touch ملتے ہیں جو اس کام کو ایک گونہ آسان کریں۔ کتاب کا یہی پہلو ہمیں سب سے اہم لگا۔ لہٰذا ترجمہ کے علاوہ کچھ کاوش ہم نے اسی حوالہ سے کی:

(۱) ہیومن اسٹ تصورات کے بطلان پر جہاں جہاں ابن تیمیہؒ کے کلام میں ہمیں کچھ ٹچ ملے' حاشیوں میں ہم نے اس کی تھوڑی نشان دہی کر دی۔

(۲) البتہ ایسے مقامات جو کسی قدر کھولنا ضروری تھے' یا کچھ مباحث جن پر ان مقامات کا کھلنا منحصر تھا' وہاں ہم نے ''تعلیقات'' کا سہارا لیا' جو ایک علیحدہ کتاب میں شائع ہوں گی' ان شاء اللہ' بعنوان ''مملکتِ اسلام بموازنہ ماڈرن سٹیٹ' خلافت' ملوکیت مؤلفہ ابن تیمیہؒ کی روشنی میں۔''

نو واردات کے حوالہ سے: آج عالمِ اسلام کے اندر ہمیں دو مسائل کا بیک وقت سامنا ہے:

(۱) ایک وہ مسلمان جو ہیومن ازم کے گھاٹ سے پی پی کر اسلام کی دریافتِ نو (rediscovering Islam) کی مشق فرماتے آ رہے ہیں۔ یہ درجہ بدرجہ کئی طبقے ہیں۔ حاشیوں اور تعلیقات میں ہماری زیادہ توجہ انہی کی طرف رہی' کیونکہ یہ اسلام کے مسخ ہی کا آلۂ کار بنتے جاتے ہیں جبکہ اس وقت کا سب سے بڑا محاذ ہماری نظر میں اسلام کو خالص رکھنا ہے۔ یہ سمجھنا درست نہیں کہ یہ ''ری فارمسٹ روش'' دی گئی صورت حال میں مسلمانوں کو ایک حل نکال کر دینے کی کوشش ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ''اسلام کی تفسیرِ نو'' کا ایک بھیانک عمل ہے' جس کے لیے ان کا استیحاء (inspiration) جدید تصورِ اجتماع سے ہو رہا ہے۔ جب بھی یہ اپنے تئیں پہلے کام کی طرف بڑھے گی (مسلمانوں کو اندریں حالات ایک راہ بنا کر دینا)' لامحالہ دوسرا کام کر آئے گی (اسلام ہی کا ایک نیا ورژن نکالنا)۔ اس لیے کہ کچھ ہیومنسٹ مسلّمات جو اسلام کے ساتھ اس کے صمیم (core) میں ہی متعارض ہیں' یہاں اذہان کی تہ میں اتر کر' دلوں میں کُھب گئے ہوئے ہیں (اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ)۔ نتیجتاً ایک ''دی گئی صورتِ حال'' میں اسلام کو راہ بنا کر دینا ان کا مسئلہ نہیں رہا' اگرچہ یہ کسی وقت ایسا سمجھ رہے ہوں گے' بلکہ مسئلہ ہو گیا ہے الحاد کی کوکھ سے برآمد ہونے والے ایک جہانی عمل کو ''اسلام'' میں راہ بنا کر دینا۔ اس طبقے کا ہر ذہن اور ہر shade دانستہ یا نادانستہ' تھوڑی دیر میں عالمِ اسلام کے اندر ہمارے دشمن کیمپ ہی کا ہراول ہو کر رہے گا۔ لہٰذا اس سے ہوشیار رہنا ہماری اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے!

(۲) دوسرا' ہمارے اسلامی تراث سے وابستہ طبقوں میں پایا جانے والا وہ ایک جامد یا آئیڈیالسٹ عنصر جو کچھ اصول وقواعد کو لاگو کرنے میں زمانے اور احوال کے فرق کو قطعی غیر متعلقہ جانتا ہے۔ تراث سے ملنے والے یہ اصول وقواعد جو بے شک حق ہیں' البتہ ایک الجھی صورتِ حال کے اندر جہاں حسنات وسیئات خلط ہوں' یا جہاں حق کے ان بہت سے ابواب کو قائم رکھنے کے لیے درکار ''قدرت'' مفقود ہو' اپنے اسلامی تراث سے ملنے والے یہ اصول وقواعد وہاں کتنے مختلف طریقوں سے لاگو ہوں گے اور وہاں ہمیں اسلام کے کس مطلوب کو کس قیمت پر حاصل کر کے رہنا ہوگا' یہ سب مباحث ان حضرات کے کوچے میں داخلہ نہیں پاتے۔ نتیجتاً ''الجماعۃ'' کے سب یا اکثر زریں مطالب ان کے یہاں ''زورِ بیان'' یا ''امید و

آرزو' (رومانس) کی چیز بن رہتے ہیں (جس کا ایک کلائمکس ''انتظارِ مہدی'' ہے)؛ جبکہ یہ نرے عزلت نشین' زندگی کی دوڑ سے باہر بلکہ زندگی کی روانی کے آگے بند باندھنے والے۔ اس (آئیڈیلسٹ) کے رُخ پر جانے والا ایک طبقہ ماضی کے محاکمہ کی طرف بڑھتا ہے اور نبی ﷺ کی رحلت کے تیس سال بعد اسلام کا سیاسی وجود کُرۂ ارض پر ختم ٹھہراتا یا اس پر کچھ سنگین سوالات اٹھاتا ہے' جبکہ اس (آئیڈیلسٹ) رُخ پر جانے والا ایک دوسرا طبقہ حال کی طرف متوجہ ہوتا ہے جہاں مسلمانوں کے بہت پیچھے رہ جانے (نیز استعمار کا مفتوح ہو جانے) کے نتیجے میں زندگی کے اکثر ندی نالے سرے سے کفار کے رُخ پر بہنے لگتے ہیں؛ اور جنہیں پھر سے اسلام کے رُخ پر بہانے کے لیے شاید صدیوں کی جُہد اور صبر درکار ہو اور بیچ کا یہ عرصہ (خالص اسلام پر اصولی و اعتقادی طور پر جمے رہ کر) عمل کے میدان میں ''مصالح اور مفاسد' کے ایک ہر دَم بدلتے موازنہ کی بنیاد پر راستہ بناتے چلے جانے کی ضرورت.... تو یہاں یہ (آئیڈیلسٹ) ذہن زمانے کو اپنے انہی زریں اصول و قواعد کی بنیاد پر بدل جانے کا ''نوٹس'' دیتا.... اور تاوقتیکہ زمانہ اس کی شرطوں پر نہیں آتا' یہ یہاں کے اجتماعی/ سیاسی عمل میں اسلام اور مسلمان کا کوئی کردار نہیں دیکھتا۔ نتیجہ: اہل عزلت 'منفیت' 'یاسیت' سرد مہری اور بے دلی۔ یا پھر ایک بھڑکیلی جذباتیت' کہ اس سے بھی بڑی فرسٹریشن کا پیش خیمہ۔ جبکہ اسلام کے اجتماعی مطالب' جن سے امت ایک دن لاتعلق نہیں رہ سکتی' ایک ''غیر معینہ'' مدّت تک معطل! اس جامد یا آئیڈیلسٹ ذہن کے لیے بھی ابن تیمیہؒ کے ان مقالات میں بہت کچھ آیا ہے' جس پر ہم اپنے حاشیوں یا تعلیقات میں کچھ نشان دہی کریں گے۔ یہ ہر دو پہلو نظر میں رہیں تو یہ کتاب ہمیں دو متحارب تباہ کن راہوں سے بچ نکلنے کے لیے ایک محفوظ متوازن سمت دیتی ہے۔''

یہاں ڈاکٹر اسامہ حسن کا موازنہ انگلستان ہی میں پلے بڑھے' پاکستان سے ۱۹۶۰ء کے اوائل میں بریڈفورڈ نقل مکانی کرنے والے بس ڈرائیور کے صاحب زادے ڈاکٹر شبیر اختر سے چشم کشا ہوگا۔ ان کا جولائی ۲۰۲۳ء میں صرف ۶۳ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ! ان کی متعدد تصنیفات میں سے کم از کم دو نے اکیڈیمیا میں اسلام کی پولیٹکل اور empowered religion کی حیثیت سے دھاک بٹھائی ہے:

☆ پہلی کتاب ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی' بعنوان *The Quran & The Secular Mind*

☆ دوسری ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی:

Islam as Political Religion: The Future of an Imperial Faith

یہ دونوں کتابیں خاصی ضخیم اور انتہائی علمی زبان میں کثیر الجہتی ٹھوس مواد لیے ہوئے ہیں۔ مصنف عبرانی اور کئی دوسری کلاسیکل زبانوں بشمول عربی سے واقفیت کے ساتھ ان میں چھپے ہوئے لٹریچر پر عبور اور ان کے مکمل ریفرنس دینے پر قادر تھے۔ انگلستان کی اعلیٰ تعلیم گاہوں کے لبرل' ہیومن اسٹ اور ملحدانہ ماحول اور بریڈفورڈ اور لندن کے بہت معمولی اور پس ماندہ ghettos میں بود و باش کے باوجود ڈاکٹر شبیر اختر نے نہ صرف مغربی فلسفہ اور سماجی علوم میں گہری بصیرت اور ناقدانہ نظر حاصل کی بلکہ اسلامی علوم اور معارف کا وسیع اور عمیق مطالعہ کر کے ''اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر'' پر پختہ یقین و ایقان کا حصول کیا جو ان کی طبع شدہ

تصنیفات میں بولتا ہے۔ مذکورہ بالا دونوں کتابیں کسی معمولی پبلشر نے نہیں بلکہ انگلینڈ‘ کینیڈا اور امریکہ میں شاخیں رکھنے والے عالمی سطح کے معروف اور بڑے پبلشر Routledge نے شائع کی ہیں۔ اہلِ علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ بڑے پبلشر کسی بھی کتاب کو peer reviews کے سخت اور طویل مرحلے سے گزارنے کے بعد ہی قابلِ اشاعت قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر شبیر اختر نے اسلام کو امپیریل فیتھ کسی جبر اور استحصال اور مبنی بر شرک والحاد کے نظام کے عالمی غلبے اور قتل و غارت کے معنی میں نہیں لیا‘ بلکہ دینِ حق کے نظریہ توحید‘ عبادتِ رب اور اُخروی فوز و فلاح کے پیغام کو پوری دنیا کے لوگوں تک پہنچانے اور انہیں ایک اللہ واحد کے آگے جھکنے اور سجدہ ریز ہونے کے جہاد کے مفہوم میں لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ٹھیٹ قرآنی اور ختم نبوت کے بعد ہم اُمتیوں پر عائد فرائض کے عین مطابق ہے۔ راقم کا حسنِ ظن ہے کہ اگر ڈاکٹر اسامہ حسن نے ان دو کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کر لیا ہوتا تو وہ ٹونی بلیئر انسٹیٹیوٹ کے تحت stateless domesticated Islam کے پیش کنندہ بننے سے بچ جاتے!‘‘

مولانا مودودیؒ نے جماعت اسلامی قائم کی تو بالکل آغاز ہی میں جو چند ثقہ‘ رسوخ فی العلم رکھنے اور تقویٰ و للّٰہیت پر فوکس کرنے والے علماء جماعت میں شامل ہوئے تھے انہوں نے مولانا مودودیؒ کے فکر میں باہر/ خارج کی دنیا اور نظام اجتماع کی تبدیلی پر زیادہ زور محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ اسرار بھائی نے بھی اپنے طبع شدہ اختلافی بیان ’’تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ‘‘ میں کچھ ایسا ہی موقف اختیار کیا‘ جس کے بعد انہوں نے اپنے طور پر احیائے دین کے کام میں حقیقی ایمان اور عمل صالح بذریعہ قرآن وسُنّت کے گہرے مطالعے اور وجودی و احوالی کیفیات کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ گویا انہوں نے مولانا رومی کی ہدایت ؎

دست ہر نااہل بیمارت کند   سوئے مادر آ کہ تیمارت کند!

کو ذہن و دِل میں اتارتے ہوئے مسلمانوں کے mother discourse یعنی کلام اللہ اور روایت پر اپنے دروسِ قرآنی اور دینی موضوعات پر لاتعداد لیکچرز میں اس نکتے پر زور دیا کہ دینی و ایمانی حقائق و مسلّمات کو internalize کیے بغیر فرد میں ایمان پختہ یقین و ایقان اور عرفانی کیفیت کے ساتھ پیدا نہیں ہوسکتا۔ تحریکی اہلِ اسلام نے دین کے ظواہر کو اہمیت دے کر اسے externalize کر دیا ہے جبکہ اصل ضرورت قبل ازیں بیان کردہ منہج کی ہے جو متوارث اور متعامل ہے۔ علم الفقہ والحدیث کے الفاظ ’’علم نضج واحترق‘‘ کے مطابق علم و عرفان وہ ہے جو پختہ ہو جائے اور جس میں تبدیلی یا حک و اضافے کا امکان نہ رہے۔ اور یہی عرفانی علم و ایقان ہے جو عالمی سطح پر فضاؤں میں موجود تشکیک‘ الحاد‘ تکثیریت‘ لبرل ازم اور سیکولرازم کو counter کر کے مشرق و مغرب میں رہنے والے کلمہ گو افراد کو اللہ کی حقیقی ’’عبدیت‘‘ پر قائم رکھ سکتا ہے!

☆☆☆

سالِ رواں کی پہلی سہ ماہی میں مارچ رمضان المبارک کا ماہ تھا۔ اس میں برادر مکرم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا

۱۹۸۴ء سے شروع کیا گیا تراویح میں مختصر تشریح کے ساتھ پورے قرآن کا ترجمہ یا ایک پارے کے خلاصۂ مضامین کا بیان تنظیم اسلامی اور انجمن ہائے خُدّام القرآن کے زیر اہتمام تمام بڑے شہروں میں منعقد ہوا۔ بحمد اللہ' راقم کے بھائی بہنوں کی اولاد بلکہ اب تیسری نسل کو بھی شامل کر لیا جائے تو ڈیڑھ درجن سے اوپر عزیزان حافظ قرآن ہیں' جن میں سے ایک بڑی تعداد مختلف مساجد میں تراویح میں قرآن سناتی ہے اور کچھ عزیزان مختصر خلاصۂ مضامین کا بیان یا مکمل دورۂ ترجمہ قرآن مجید کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ قرآن اکیڈمی کی مسجد ''جامع القرآن'' میں اس رمضان میں دورۂ ترجمہ کی ذمہ داری عزیزم حافظ عاطف وحید (ناظم اعلیٰ' مرکزی انجمن خدام القرآن) نے انجام دی۔ چونکہ اس جگہ مؤسس انجمن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس مبارک کام کا آغاز کیا تھا اس لیے کثیر تعداد پرانے رفقاء واحباب کی اور بہت سے نئے حضرات بھی عاطف صاحب کے انتہائی مؤثر اور دِل نشیں انداز میں بیان کیے گئے ترجمے اور مختصر تشریح سننے کے لیے تشریف لاتے رہے۔ بحمد اللہ' عزیزم اسلامی علوم ومعارف کا وسیع اور عمیق مطالعہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ قرآن وسُنّت کے پیامِ حق کو روشن اور درخشاں کرنے کی امکان بھر کوشش کی۔ حاضرین کا انہماک اتنا دیکھنے میں آیا کہ چائے کے وقفے کے بعد بھی کثیر تعداد آخر تک مسجد میں موجود رہتی تھی' جس کا اندازہ باہر سڑکوں پر ہر چہار طرف کاروں اور موٹر سائیکلوں کی موجودگی سے ہوتا تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزم عاطف وحید کو صحت وعافیت کے ساتھ دینِ متین کی مزید خدمت کرنے کی توفیق ارزاں کیے رکھیں اور وہ قرآن اکیڈمی کے شعبہ تحقیق وتدریس اور جامعۃ القرآن کے جملہ کٹھن مسائل سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہوتے رہیں۔ آمین!

بڑے بھائی وقار احمد صاحب کے صاحب زادے انجینئر حافظ عبداللہ محمود (جو راقم کے داماد بھی ہیں) قرآن اکیڈمی کی مسجد کے نمازیوں کے لیے جانے پہچانے ہیں' کیونکہ صدرِ انجمن ڈاکٹر عارف رشید صاحب انہیں گاہے بگاہے جمعہ کے خطاب اور نماز کی امامت کے لیے دعوت دیتے رہتے ہیں۔ تنظیم اسلامی کے حلقہ لاہور غربی کے سہ ماہی اجتماع میں بھی اکثر ان کا درسِ قرآن رکھا جاتا ہے۔ ایک خوش الحان حافظ قرآن ہونے کے علاوہ وہ تفسیر اور کُتبِ احادیث کا وسیع مطالعہ بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سال گزشتہ کی طرح اس رمضان میں بھی جوہر ٹاؤن میں پی آئی اے روڈ کے مشرقی حصے میں واقع پنجاب سوسائٹی کی مسجد میں عشاء کی نماز میں طویل قراءت اور آدھی تراویح کی نماز کے بعد تقریباً ایک گھنٹے پر مبنی پڑھے اور سنے جانے والے حصہ کا جامع خلاصہ ہر روز پیش کیا۔ عزیزم عبداللہ محمود پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہیں اور ذاتی کاروبار کے ساتھ کارِ جہاں بانی کے رموز سے بھی خوب واقف ہیں۔ مزید برآں' ملکی اور عالمی سیاست کے مسائل میں بھی دلچسپی اور قرآن وسُنّت کے حوالے سے مفید تبصرے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ مختصر دورہ قرآن کی اس بابرکت محفل کی خاص بات یہ تھی کہ مسجد کے بالکل قریب رہائش رکھنے والے محترم احمد جاوید صاحب نے بھی اس پروگرام میں باقاعدگی سے شرکت کی۔ ۲۸ ویں شب کو تکمیلِ قرآن کے موقع پر انہوں نے اپنی خواہش پر خطاب بھی کیا اور عزیزم کے بیان کو بہت سراہا۔ ساتھ ہی

ان کے تایا ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی تحریک رجوع الی القرآن کے لیے بھی تعریفی کلمات کہے اور اس کے مزید پھیلاؤ اور مؤثر ہونے کی دعا کی۔ راقم بھی انہیں اور ان کے والد محترم کو خیر وعافیت کی دعاؤں میں یاد رکھتا ہے۔

مکمل دورۂ ترجمہ قرآن کی تیسری اور آخری نشست جس کو راقم بیان کرنا ضروری سمجھتا ہے‘ وہ برادر گرامی ڈاکٹر صاحبؒ کے نواسے عزیزم استاذ مومن محمود کی تھی جو مختصر سی جگہ پر واقع ’’فاتح فاؤنڈیشن پاکستان‘‘ کے لاہور کیمپس میں قائم ’’غزالی فورم‘‘ کے تحت عزیزم استاذ ڈاکٹر رشید ارشد سلمہ نے منعقد کروائی۔ وہ خود بھی کلام پاک کے نسخے کے ساتھ اس پورے دورہ میں بیٹھتے اور استماع کرتے رہے۔ عزیزم مومن محمود صحیح معنوں میں قدیم جملہ علوم نبوت کے جدید شناور ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن کے آفاقِ فہم کبھی ختم نہیں ہو سکتے‘ نہ آفاقِ معانی اور نہ آفاقِ زمانی۔ وہ اپنی جگہ چشمۂ صافی اور کافی ہے۔ اس چشمۂ صافی کی عذوبت سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جس کے اور قرآن کے درمیان کسی اور کا عکس حائل نہ ہو۔ علم الکلام اور لغت کے قدیمی مباحث اب بہت سے جدید دانش وَروں کے نزدیک مندرس اور پیش پا افتادہ ہیں۔ عزیزم کی انتہائی پُر مغز اور ساتھ ہی مختصر اور اشاراتی زبان اور رُوح پرور انداز میں گفتگو اس کا مدلل ابطال تھی۔ عقل کو ایمانی بننے کے لیے جن دلائل کی ضرورت ہے‘ وہ بھی فراہم کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ قرآن میں غوطہ زنی‘ گہرے تفقہ اور عمیق علم کے بغیر ممکن نہیں۔ محترم احمد جاوید صاحب کے الفاظ مستعار لوں تو یہ دورۂ قرآن ذاتی طور پر میرے لیے ’’قربِ جلالِ حق کا سفرنامہ‘‘ تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزم کے علم وعرفان کو مزید بڑھائیں اور ان کے نانا اور ہم سب کے لیے آخرت میں اجر وانعام کا باعث بنائیں!

راقم کی درخواست پر قرآن اکیڈمی کے رجوع الی القرآن کورس (پارٹ ٹو) کے ایک طالب علم (جنہوں نے چند اور کلاس فیلوز کے ساتھ دورۂ قرآن کا استماع کیا) عزیزم عثمان عباس کی ایک تاثری تحریر بھی یہاں قارئین کے لیے پیش کی جا رہی ہے‘ جسے انہوں نے ’’ایک منفرد تجربہ‘‘ کہا ہے:

’’مجھے اس سال غزالی فورم لاہور میں منعقدہ ’’دورہ ترجمہ قرآن‘‘ میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی‘ الحمدللہ‘ جس کے مدرس استاد محترم مومن محمود صاحب تھے۔ آج کے دور میں‘ جب دین کا بنیادی ماخذ اکثر نوجوانوں کے لیے انٹرنیٹ‘ یوٹیوب چینلز اور پوڈکاسٹس جہاں درست باتوں کے ساتھ ساتھ بہت سی عجیب وغریب سائنسی تفاسیر‘ خود ساختہ تاویلات اور مذموم آرا کی ملونی ہوتی ہے‘ وہاں استاد محترم نے بغیر کسی تکلف اور بناوٹ کے قرآن کو اس طرح بیان کیا کہ ہر خاص وعام کو اس سے رہنمائی حاصل ہو۔ خاص طور پر ان نوجوانوں کے لیے یہ دورہ ایک نعمت ثابت ہوا‘ جن کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہوتی جا رہی تھی کہ قرآن صرف اس وقت ’’قابلِ فہم‘‘ ہوتا ہے جب اسے جدید سائنس یا محض دورِ حاضر کے تحت بیان کیا جائے۔
اگرچہ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ من لم یعرف اھل زمانہ فھو جاھل مگر ہر چیز کا ایک نسبت تناسب ہونا چاہیے۔ جس چیز کی جتنی اہمیت ہو اسے اتنی اہمیت ہی دینی چاہیے اور یہ چیز مجھے اس دورہ میں نظر آئی۔ یہ بھی ایک عجیب رواج پڑتا جا رہا ہے کہ ایک شخص کا ایمان اس وقت تو بڑھے جب قرآن کی جدید تفسیر کی جائے لیکن جس پس منظر میں قرآن نازل ہوا اگر اس میں سنایا جائے تو وہ حجاب محسوس کرے۔ اگرچہ قرآن مجید

میں ہر طبقہ کے لیے ہدایت ہے مگر قرآن مجید کی بیشتر آیات انسان کو بدلنے، غفلت سے جگانے اور اللہ سے جوڑنے کے لیے نازل ہوئیں۔ جنت و دوزخ کی یاد دہانی، انبیاء کرام ﷺ کے واقعات، آفاقی و انفسی آیات کا مرکزی پیغام ایک عام آدمی کے لیے یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کرے، عبد منیب بنے اور عبودیت کی منازل طے کرے جیسا کہ اللہ پاک نے قرآن مجید میں فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾۔

اس دورے نے ہمیں اس بات کا قوی احساس دلایا کہ قرآن کا مقام اس سے کہیں بلند ہے کہ اس کی عظمت کو محض جدید سائنسی نظریات سے ''ثابت'' کیا جائے۔ بہرحال یہ دورہ ایک بہت احسن انداز میں مکمل ہوا۔ استاد مومن محمود صاحب نے قرآن فہمی کا کوئی نیا زاویہ پیش نہیں کیا اور یہی اس دورے کا حسن تھا۔ انہوں نے ہمیں اسلاف کے طرزِ فہم پر قرآن کو سمجھانے کی سعی کی، یعنی وہی زاویہ جو اہل سُنّت کے علماء کے ہاں محفوظ چلا آ رہا ہے۔

ایک نمایاں پہلو تزکیۂ نفس تھا۔ استاد محترم نے بار بار ہمیں یاد دلایا کہ قرآن کا مقصد صرف معلومات نہیں، بلکہ قلوب کی اصلاح اور عرفانِ الٰہی کی طرف سفر ہے۔ بعض مواقع پر انہوں نے مختلف قُرّاء جیسے شیخ صدیق منشاوی وغیرہ کی خاص تلاوت کا حوالہ دیا اور مختلف آیات جو دنیا کی حقیقت ہمارے سامنے کھولتی ہیں پر غور و فکر اور مراقبہ کرنے اور بار بار سننے کا کہا جو کہ ایک بہت اچھا تجربہ تھا اور اس سے قرآن سننے کا شوق بھی پیدا ہوا۔

استاد محترم کو ان آیات کا بھی بخوبی ادراک تھا جن سے لوگ غلط نظریات اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان مقامات پر انہوں نے اہل سُنّت کے محکم دلائل سے مختصر اور مدلل وضاحت کی، جس سے عقائد کی اصلاح ہوئی اور بہت سی الجھنیں دور ہوئیں اور زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے اور علم کی گہرائی پیدا کرنے اور حفاظت دین کے وسیع تر مفہوم کو سمجھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اگرچہ اللہ کے فضل سے میں نے تمام نشستوں میں شرکت کی، لیکن انسانی کمزوریوں کے باعث کچھ نکات رہ گئے۔ غزالی فورم کا شکریہ کہ انہوں نے مکمل دورہ ریکارڈ کرلیا، جو اب ایک بڑا علمی ذخیرہ بن چکا ہے نہ صرف میرے لیے بلکہ ان سب کے لیے جو کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ چونکہ دورہ یک طرفہ ہوتا ہے، اس لیے کچھ سوالات ذہن میں ابھرے جو کہ اس طرح کے دورہ کے نتیجے میں پیدا ہونے بھی چاہئیں۔ ہم کچھ شرکاء نے استاد محترم سے گزارش کی کہ عید الفطر کے بعد خصوصی وقت دیں تاکہ سوالات کی نشست ہو سکے، اور انہوں نے شفقت فرماتے ہوئے وقت دینے کا وعدہ بھی کرلیا۔

یہ دورہ نہ صرف قرآن فہمی کا ایک خوبصورت موقع تھا، بلکہ تزکیۂ نفس کا ذریعہ بھی۔ اللہ تعالیٰ استاد محترم مؤمن محمود صاحب، غزالی فورم کی پوری ٹیم اور تمام منتظمین کی کاوشوں کو قبول فرمائے، اور ہمیں قرآن سے سچی محبت، سمجھ اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

اللّٰهُمَّ اجْعَلِ الْقُرْآنَ رَبِيعَ قُلُوبِنَا، وَنُورَ صُدُورِنَا، وَجَلَاءَ أَحْزَانِنَا، وَذَهَابَ هُمُومِنَا

''اے اللہ! قرآن کو ہمارے دلوں کی بہار، سینوں کا نور، غموں کا مداوا، اور پریشانیوں کا خاتمہ بنادے!''

❁❁❁

مِلاکُ التأوِیل (۴۰)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورَۃُ الْحَجّ

(۲۵۷) آیت ۵

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّنَ الۡبَعۡثِ فَاِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنۡ مُّضۡغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَیۡرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمۡ ؕ وَنُقِرُّ فِی الۡاَرۡحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخۡرِجُكُمۡ طِفۡلًا ثُمَّ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَشُدَّكُمۡ ۚ وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ یُّتَوَفّٰی وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ﴾

’’اے لوگو! اگر تمہیں دوبارہ جی اٹھنے میں شک ہے تو پھر (جان لو) کہ ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا‘ پھر نطفے سے‘ پھر جمے ہوئے خون سے‘ پھر گوشت کے ایک لوتھڑے سے کہ ان میں سے کچھ پوری خِلقت رکھتے ہیں اور کچھ نہیں‘ تاکہ تمہارے اوپر (اپنی کمال قدرت کو) واضح کردیں۔ اور پھر ان میں سے جسے ہم چاہتے ہیں ایک مقررہ مدت تک رحم (مادر) میں رکھتے ہیں‘ پھر تمہیں بچہ بنا کر باہر نکالتے ہیں‘ پھر تمہیں اپنی قوی ترین حالت تک پہنچنے دیتے ہیں۔ اور تم میں کچھ وفات پا جاتے ہیں اور کچھ ایک نکمّی عمر کی طرف لوٹا دیے جاتے ہیں۔‘‘

اور سورۃ المؤمن کی آیت ۶۷ میں ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخۡرِجُكُمۡ طِفۡلًا ثُمَّ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَشُدَّكُمۡ ثُمَّ لِتَكُوۡنُوۡا شُیُوۡخًا ۚ وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ یُّتَوَفّٰی مِنۡ قَبۡلُ وَلِتَبۡلُغُوۡۤا اَجَلًا مُّسَمًّی وَّلَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۷﴾﴾

’’وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا‘ پھر نطفے سے‘ پھر خون کے جمے ہوئے لوتھڑے سے‘ پھر وہ تمہیں بچے کی صورت میں نکالتا ہے‘ پھر (تمہیں موقع دیتا ہے) تاکہ تم اپنی قوی ترین عمر کو پہنچو‘ پھر تم بڑھاپے کو پہنچ جاتے ہو۔ اور تم میں سے کچھ لوگ اس سے پہلے ہی فوت ہو جاتے ہیں‘ اور (یہ سب اس لیے) تاکہ تم سب ایک مقررہ مدت تک (اپنی عمر میں) پہنچو اور شاید تم سمجھ سکو۔‘‘

ملاحظہ ہو کہ پہلی آیت میں چند اضافی مراحل کا ذکر ہے‘ جو دوسری آیت میں بیان نہیں ہوئے‘ جیسے: ﴿ثُمَّ مِنۡ

مُّضۡغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيۡرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَـكُمۡ ؕ وَنُقِرُّ فِى الۡاَرۡحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾۔

اب ملاحظہ ہو کہ سورۃ الحج میں تخلیقِ انسان کے کئی ایسے مراحل بیان ہوئے ہیں جو سورۃ المؤمن میں بیان نہیں ہوئے۔ مثلاً سورۃ الحج میں بتایا گیا کہ نطفہ جب علقہ (جامد خون کا لوتھڑا) بن جاتا ہے تو پھر وہ اگلے مرحلہ میں مضغہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مضغہ گوشت کی ایسی بوٹی کو کہا جاتا ہے جو چبائی جا سکے۔ اور یہ مضغہ بھی دو طرح کے انجام کو پہنچتا ہے' تام الخلق یا ناقص الخلق۔ یہاں پر اسقاطِ حمل کا بیان نہیں ہوا۔ اسے ہم آیت کے اس ٹکڑے سے سمجھ سکتے ہیں: ﴿ وَنُقِرُّ فِى الۡاَرۡحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ﴾ ''اور ہم رحم میں استقرار بخشتے ہیں جسے چاہیں ایک خاص مدت تک'' جس کا مفہوم یہ ہوا کہ جسے نہ چاہیں اسے پہلے ہی گرا دیتے ہیں۔ مضغہ کی نقش گری کا تذکرہ سورۂ آلِ عمران میں کیا گیا۔ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِىۡ يُصَوِّرُكُمۡ فِى الۡاَرۡحَامِ كَيۡفَ يَشَآءُ ؕ﴾ (آیت ٦)

''وہی ہے جو تمہیں رحم میں ایک صورت سے نوازتا ہے جیسے چاہتا ہے۔''

مراد شکل وصورت اور رنگ وغیرہ ہے اور اسی میں یہ بات بھی آ جاتی ہے کہ کسی کو پورے اعضاء اور حواس عطا ہوتے ہیں اور کسی کو نقص کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے۔

''اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى '' کہہ کر واضح کر دیا کہ رحم مادر میں بچہ کتنی دیر رہے گا وہ بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے' ولادت کب اور کیسے ہوگی' سب اللہ کی قدرت میں ہے۔ اور یہی وہ سوال ہے کہ جو پوچھا جا سکتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں یہ اختلاف کیوں واقع ہوا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے (واللہ اعلم) کہ سورۃ الحج کی آیت کا اصل مقصد قیامت کے دن اٹھائے جانے پر دلیل قائم کرنا ہے تا کہ دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرنے والوں پر حُجت قائم کی جا سکے۔

اب دیکھئے کہ تخلیقِ انسان میں کتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے' ایک مرحلہ بتدریج دوسرے مرحلے میں منتقل ہو جاتا ہے اور یہ تبھی ممکن ہے جب کہ اس کے پیچھے ایک ایسی ہستی ہو جو فاعل ہو' قدرت رکھتی ہو' حکمت سے معمور ہو' پورا اختیار رکھتی ہو' ایک ایک بات کا علم رکھتی ہو۔ اس بات کی وضاحت کئی دوسری آیات میں بھی کی گئی' فرمایا:

﴿وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِىَ خَلۡقَهٗ ؕ﴾ (یٰسٓ :٧٨)

''وہ ہمارے لیے ضرب المثل پیش کرتا ہے لیکن اپنی خلقت کو بھول جاتا ہے۔''

اور فرمایا:

﴿ كَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِيۡدُهٗ ؕ﴾ (الانبیاء :١٠٤)

''جیسے ہم نے پہلے پیدا کیا ویسے ہی ہم دوبارہ اُسے لوٹائیں گے۔''

اور پھر سورۃ الحج کی اگلی آیت سے بھی اس مقصود کی تاکید کی جاتی ہے:

﴿وَتَرَى الۡاَرۡضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ وَاَنۡۢبَتَتۡ مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۢ بَهِيۡجٍ ۝۵﴾

’’اور تم زمین کو بنجر اور خشک دیکھتے ہو اور پھر جب ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو وہ لہلہا اٹھتی ہے‘ اور خوب پھلتی اور پھولتی ہے اور پھر ہر طرح کی بارونق نباتات اگاتی ہے۔‘‘

تو یہاں ذکر ہو گیا کہ مردہ زمین کو کیسے زندہ کیا۔ اور پھر ارشاد فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۶﴾

’’یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

اب آپ اس آیت کے افتتاحی کلمات ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ﴾ کو دیکھ لیں اور پھر اس کے آخر تک پڑھتے جائیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ منکرین بعث کا کس خوبصورتی سے ردّ کیا گیا ہے۔

سورۃ المؤمن میں خاص اس غرض کے لیے کلام نہیں کیا گیا‘ البتہ اختصار کے ساتھ ضمناً اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ سورۃ کا اصل مضمون یہ ہے کہ مخلوق کو اللہ کی وحدانیت کا سبق دیا جائے اور یہ کہ اللہ ہی پیدا کرنے والا اور حکم دینے والا ہے‘ اس کے ساتھ ان دونوں چیزوں میں کوئی شریک یا ہمسر نہیں ہے‘ اللہ کے سوا اور کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ اس مضمون کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے:

﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ﴾

’’یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش لوگوں کو پیدا کرنے سے بڑی بات ہے۔‘‘

اور پھر مذکورہ آیت ۶۷ تک اسی مقصود کا احاطہ کیا گیا ہے‘ اور یوں واضح ہو گیا کہ سورۃ الحج میں وہ زائد تفصیلات کیوں دی گئیں جو سورۃ المؤمن میں نہیں دی گئیں۔ یعنی ہر دو سورتوں میں جو کچھ بیان کیا گیا وہ اس کے ساتھ ہی خاص تھا‘ واللہ اعلم!

(۲۵۸) آیت ۲۲

﴿كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۲۲﴾

’’اور جب کبھی وہ اس (جائے) غم سے نکل بھاگنے کی کوشش کریں گے تو پھر اسی میں لوٹا دیے جائیں گے‘ اور (ان سے کہا جائے گا کہ) چکھو اب جلنے کا عذاب۔‘‘

اور سورۃ السجدۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝۲۰﴾

’’جب کبھی وہ اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو وہ اس میں لوٹا دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ چکھو آگ کا وہ عذاب جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔‘‘

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) سورۃ الحج میں ’’مِنْ غَمٍّ‘‘ کے الفاظ ہیں جو سورۃ السجدۃ میں نہیں لائے گئے۔

(۲) دونوں آیتوں کے آخری الفاظ میں اختلاف واقع ہوا ہے۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۃ الحج میں طرفین (کُفّار اور مؤمنین) کی اُخروی جزا اور سزا یعنی ثواب اور عذاب کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے‘ اس لیے مناسب تھا کہ کُفّار کے تذکرے میں اس عذاب کی نوعیت کا واضح تذکرہ کر دیا جائے۔ اس لیے ’’مِنْ غَمٍّ ‘‘ کے اضافی الفاظ بیان ہوئے۔

ملاحظہ ہو کُفّار کے عذاب کا تذکرہ ان الفاظ کے ساتھ ہو رہا ہے:

﴿فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿١٩﴾﴾

’’اور جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ ہی میں سے کپڑے کاٹ کاٹ کر بنائے گئے‘ اور ان کے سروں پر گرم پانی انڈیلا گیا۔‘‘

﴿يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿٢٠﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿٢١﴾﴾

’’جس سے وہ سب کچھ گلا دیا جائے گا جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے اور ان کی کھالیں بھی۔ اور ان (کی سزا) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔‘‘

اس کے بالمقابل اہلِ ایمان کی جزا اس تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ؕ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿٢٣﴾﴾

’’بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے‘ ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی‘ وہاں انہیں سونے کے کنگن اور ہیرے پہنائے جائیں گے۔ اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا۔‘‘

اسی طرح کی تفصیل سورۃ النساء میں بھی ہے۔ کُفّار کے تذکرے میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿٥٦﴾﴾

’’بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا‘ عنقریب ہم انہیں آگ میں تپائیں گے۔ جوں جوں ان کی کھالیں پکتی جائیں گی ہم انہیں دوسری کھالوں سے بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزا چکھتے رہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہیں‘ حکمت والے ہیں۔‘‘

اور اہلِ ایمان کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿٥٧﴾﴾

’’اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہم انہیں عنقریب ایسی جنتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے لیے وہاں پاک وصاف بیویاں ہوں گی اور ہم انہیں گھنی چھاؤں کے اندر داخل کریں گے۔‘‘

چنانچہ جہاں کلام میں طوالت ہوتی ہے تو وہاں ہمیشہ تفصیلی خطاب ہوتا ہے۔ سورۃ السجدہ کی آیت ملاحظہ ہو

جہاں کلام میں اختصار ہے‘ فرمایا:

﴿اَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ جَنّٰتُ الۡمَاۡوٰی ۫ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۹﴾﴾

’’اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے‘ ان کے لیے جنتیں ہیں جہاں وہ قیام کریں گے۔ یہ ان کے لیے ضیافت ہوگی ان اعمال کی بنا پر جو وہ کیا کرتے تھے۔‘‘

﴿وَاَمَّا الَّذِیۡنَ فَسَقُوۡا فَمَاۡوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَاۤ اُعِیۡدُوۡا فِیۡهَا وَقِیۡلَ لَهُمۡ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۲۰﴾﴾

’’اور جن لوگوں نے حکم عدولی کی‘ ان کا ٹھکانہ آگ ہوگی۔ جب کبھی وہ وہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے تو وہ اس میں دوبارہ لوٹا دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا: چکھو اس آگ کا عذاب جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔‘‘

اب یہاں چونکہ کلام میں اختصار ہے‘ اس لیے ’’مِنۡ غَمٍّ‘‘ کے اضافہ کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح کا اختصار سورۃ النازعات میں پایا جاتا ہے۔ دونوں اطراف (کُفّار اور اہلِ ایمان) کی جزا کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿فَاِنَّ الۡجَحِیۡمَ هِیَ الۡمَاۡوٰی ﴿۳۹﴾﴾ ’’تو پھر جہنم ہی ان کا ٹھکانہ ہے۔‘‘

اور

﴿فَاِنَّ الۡجَنَّةَ هِیَ الۡمَاۡوٰی ﴿۴۱﴾﴾ ’’بے شک جنت ہی ان کا ٹھکانہ ہے۔‘‘

ان دونوں آیتوں اور سورۃ السجدۃ کی آیت میں کوئی فرق نہیں ہے‘ اور یوں ظاہر ہوگیا کہ سورۃ الحج کی آیت میں بربنائے تفصیل وہ الفاظ آئے جو سورۃ السجدۃ میں بربنائے اختصار حذف کر دیے گئے۔ تو جو جس آیت میں مناسبت رکھتا تھا وہ اس میں لایا گیا اور جہاں مناسبت نہیں تھی وہاں نہیں لایا گیا‘ اور اگر اس کا اُلٹ کیا جاتا تو قطعاً غیر مناسب ہوتا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۃ السجدہ کی آیت کے آغاز میں کہا گیا: ﴿وَاَمَّا الَّذِیۡنَ فَسَقُوۡا﴾۔ ’’فسق‘‘ بمعنی خروج ہے۔ یہ خروج صرف نافرمانی کی حد تک بھی ہوسکتا ہے اور کبھی کفر کی سرحد تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں چونکہ یہ دوسرا معنی مطلوب ہے اس لیے آیت کے آخر میں وضاحت کر دی گئی کہ چونکہ انہوں نے اخروی انجام کو جھٹلایا تھا‘ اس لیے اب اس انجام کو بھگتو! فرمایا:

﴿وَقِیۡلَ لَهُمۡ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیۡ كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۲۰﴾﴾

(ترجمہ گزر چکا ہے)

اور جہاں تک سورۃ الحج کی آیت کا تعلق ہے تو شروع ہی میں ان کے کفر کا تذکرہ بالفاظ ﴿فَالَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا﴾ آچکا تھا‘ اس لیے سورۃ السجدۃ والا اسلوب وہاں مناسب نہ تھا۔

سورۃ السجدۃ سے مماثل ایک مقام سورۂ سبا کا بھی ہے جہاں آیت کے آخر میں آگ کے عذاب کا تذکرہ ہے اور ان لوگوں کا بھی جو اس میں جانے کے مستحق قرار دیے گئے تھے۔ فرمایا:

﴿ فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾ ﴾

''پس آج تم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو نفع یا نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہوگا۔ اور ہم ان لوگوں سے کہیں گے جنہوں نے ظلم کیا تھا: چکھو اس آگ کا عذاب جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔''

یہاں لفظ ''ظلم'' استعمال ہوا ہے اور فسق کی طرح وہ بھی دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ نافرمانی جو کفر تک نہ پہنچی ہو یا وہ معصیت جو جھٹلانے اور کفر کی حدوں تک پہنچ جائے' اور یہاں بھی آیت کے آخری ٹکڑے نے واضح کر دیا کہ اس سے مراد دوسرا معنی ہے۔

اب رہا دونوں آیتوں میں ضمیر کا اختلاف کہ ایک آیت میں ﴿ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ ﴾ کہا گیا اور دوسری میں ﴿ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا ﴾ کہا گیا تو وہ اس وجہ سے ہے کہ سورۃ السجدۃ میں ضمیر مذکر ہے اور اس کا مرجع لفظ ''عذاب'' ہے جو مذکر ہے' جبکہ سورۃ سبا میں ضمیر مؤنث ہے اور وہ لفظ ''نار'' کی طرف لوٹتی ہے جو کہ مؤنث ہے۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۃ السجدۃ میں خاص طور پر ضمیر مذکر کیوں لائی گئی تو اس کا جواب ہم سورۃ السجدۃ پر کلام کرتے ہوئے عرض کریں گے۔ ملحق نمبر ۲۹۴ (سورۃ السجدۃ)

(موضوع کی مناسبت سے ہم ان دونوں آیتوں کے موازنہ پر مشتمل کلام کو یہیں درج کیے دیتے ہیں' مترجم)

دونوں آیتوں میں ضمیر کے مرجع کا اختلاف ہے' چنانچہ سورۃ السجدۃ میں ضمیر مذکر لائی گئی ہے کیونکہ اس کا مرجع عذاب ہے اور سورۃ السجدۃ میں اس کا لانا اس لیے مناسب تھا کہ اس سورت میں خاص طور پر دو دفعہ عذاب کا ذکر آیا ہے' فرمایا:

﴿ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾ ﴾

''اور ہم انہیں ایک عذابِ ادنیٰ (قریب ترین اور کم ترین) چکھائیں گے اس عذاب سے پہلے جو بڑا ہوگا تاکہ وہ (حق کی طرف) لوٹ آئیں۔''

تو اس سے قبل آیت میں ''عذاب النار'' کا تذکرہ ہوا تھا تو مناسب تھا کہ سورت کے عمومی مضمون کو دیکھتے ہوئے ''عَذَاب'' ہی کی طرف ضمیر مذکر لوٹائی جاتی' لیکن سورۂ سبا میں ایسی کوئی بات نہ تھی اس لیے وہاں ''النَّار'' کی طرف ضمیر مؤنث لوٹائی گئی اور اس طرح ایک ہی حقیقت کو دو طرح بیان کر دیا گیا' واللہ اعلم!

(۲۵۹) آیت ۴۵

﴿ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ﴾

''اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا کہ وہ ظالم تھیں۔''

اور اس کے بعد آیت ۴۸ میں ارشاد فرمایا:

﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ﴾

’’اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ جن کو ہم نے ڈھیل دی کہ وہ ظالم تھیں۔‘‘

سوال یہ ہے کہ ایک میں ہلاکت کا ذکر کیا گیا اور دوسری میں مہلت دینے کا تو اس اختلاف کا سبب کیا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ پہلی آیت سے قبل کئی قوموں کا ذکر کیا گیا جنہوں نے اپنے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تھا‘ اللہ نے ان کو مہلت بھی دی لیکن انہوں نے اپنی حالت نہ بدلی تو پھر ان کی ہلاکت مقدر ہوگئی۔ فرمایا:

﴿فَاَمۡلَيۡتُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ‌ۚ﴾ (آیت ۴۴)

’’تو پھر میں نے کافروں کو مہلت عطا کی اور بعد ازاں انہیں آ دبوچا۔‘‘

ایسے ہی سورۃ الرعد میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدِ اسۡتُهۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَاَمۡلَيۡتُ لِلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ‌ۖ﴾ (آیت ۳۲)

’’اور آپ سے قبل بھی کئی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو میں نے کفر کرنے والوں کو مہلت دی اور اس کے بعد انہیں آن پکڑا۔‘‘

لیکن سورۃ الحج کی دوسری آیت سے قبل ان کے ’’استعجال‘‘ کا ذکر ہے یعنی ان کا یہ کہنا کہ یہ عذاب جس کا تم بار بار ڈراوا دیتے رہتے ہو وہ جلد آ کیوں نہیں جاتا؟ فرمایا: ﴿وَيَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالۡعَذَابِ﴾ (آیت ۴۷) ’’اور وہ عذاب کی جلدی مچائے ہوئے ہیں۔‘‘ تو معلوم ہوا کہ انہیں مہلت دی جا رہی تھی اس لیے جلد عذاب نہیں آیا۔

سورۂ آلِ عمران میں اس مہلت کا ایک سبب یہ بھی بیان ہوا:

﴿اِنَّمَا نُمۡلِىۡ لَهُمۡ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا‌ ۚ﴾ (آیت ۱۷۸)

’’ہم انہیں اس لیے مہلت عطا کرتے ہیں کہ وہ اپنے گناہوں میں مزید اضافہ کر سکیں۔‘‘

(مطلب یہ ہے کہ مہلت تو اس لیے دی جا رہی تھی کہ وہ تائب ہو کر پاسداری کی راہ اختیار کریں لیکن انہوں نے اس مہلت کو گناہوں میں اضافے کا موقع بنا لیا: مترجم)

گویا یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب یہ لوگ عذاب کی جلدی مچا رہے تھے تو انہیں یاد دلایا گیا کہ تم سے قبل بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جو عذاب آنے کو دور کی بات سمجھ رہے تھے لیکن بالآخر وہ عذابِ الٰہی سے کچلے گئے‘ اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا:

﴿وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَمۡلَيۡتُ لَهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذۡتُهَا‌ ۚ﴾

(ترجمہ گزر چکا ہے)

اور آیت کا آخری ٹکڑا بھی اس بات کی تاکید کرتا ہے:

﴿وَاِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ ۝۴۸﴾ ’’اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔‘‘

گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ جلدی تو وہ مچاتا ہے جسے اس بات کا خوف ہو کہ کہیں وہ رہ نہ جائے‘ لیکن اگر وہ یہ جانتا ہو کہ یہاں رہ جانے والا کوئی بھی نہ ہوگا‘ بلکہ دیر سویر ہر شخص نے بالآخر اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے تو پھر اسے جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ اب یہ اللہ کی مرضی ہے کہ کب کس کو اس کے جرم کی پاداش میں پکڑ لے‘ اور اگر چاہے تو کسی کو مہلت

بھی دے کہ جس کی وجہ سے اس کی آزمائش میں مزید اضافہ بھی ہو جائے۔

اور یوں دونوں آیتوں کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے اور ہر آیت میں جو لفظ استعمال ہوا ہے' وہ وہیں مناسب تھا اور اس میں ردّ و بدل کا قطعاً کوئی مقام نہ تھا' واللہ اعلم!

(۲۶۰) آیت ۴۷

﴿وَاِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴿۴۷﴾﴾

''تیرے رب کے نزدیک ایک دن' تمہاری گنتی کے حساب سے ایک سال کے برابر ہے۔''

اور سورۃ السجدۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ ثُمَّ یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗۤ اَلۡفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴿۵﴾﴾

''وہ آسمان سے لے کر زمین تک ہر کام کی تدبیر کرتا ہے' پھر یہ (کارروائی) ایک دن میں اس کی طرف عروج کر جاتی ہے کہ جس کی مقدار تمہاری گنتی کے مطابق ایک ہزار سال کی بنتی ہے۔''

اور سورۃ المعارج میں ارشاد فرمایا:

﴿تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوۡحُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗ خَمۡسِیۡنَ اَلۡفَ سَنَۃٍ ﴿۴﴾﴾

''فرشتے اور روح (جبرائیلؑ) اس کی طرف اس ایک دن میں عروج کر جاتے ہیں کہ جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔''

ان آیات میں ایک دن سے کیا مراد ہے اور اس کی مقدار میں اختلاف کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے (واللہ اعلم) کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے فعل میں کسی تکلف اور کارروائی کی ضرورت نہیں ہے:

﴿اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۸۲﴾﴾ (یٰسٓ)

''جب بھی وہ کوئی چیز چاہتا ہے' اس کا اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ''ہو جا'' تو وہ چیز ہو جاتی ہے۔''

گویا کہ یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر وہ تمہیں عذاب دینا چاہے تو وہ فوراً واقع ہو سکتا ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کام میں کسی کی مدد' کسی کی حاجت یا کسی قسم کی کارروائی کی ضرورت نہیں ہے۔ جب بھی وہ کچھ کرنا چاہتا ہے وہ اتنے تھوڑے عرصے میں ہو جاتا ہے کہ تمہارے اندازے کے مطابق تو اس کام کے ہونے میں ایک ہزار سال لگنے چاہئیں تھے (یا اس سے بھی زیادہ)۔ اُس کے افعال لوگوں کے افعال کی مانند نہیں ہیں کہ وہ ہر کام کے کرنے میں اسباب' وسائل اور کارروائی کے محتاج ہوتے ہیں' وہ تو صرف ''کُنۡ'' کہتا ہے تو آناً فاناً وہ کام ہو جاتا ہے۔ تو پھر تمہیں اس بات کی جلدی کیوں ہے جس کے واقع ہونے میں قطعاً کسی تکلف کی ضرورت نہ ہو گی۔ اگر وہ بات جلدی واقع نہیں بھی ہوتی تو وہ اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ اس کی ایک اجل مقرر ہے اور یہ اجل قیامت کا دن ہے۔ اب یہ اللہ کی مرضی ہے کہ کسی کو دنیا ہی میں عذاب کا مزا چکھا دے' یا اسے آزمائشوں میں ڈال دے' یا کسی کی آزمائش بڑھانے کے لیے اسے مزید مہلت عطا فرما دے۔ اسی بات کو ان آیات میں واضح کیا گیا ہے:

﴿وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَمۡلَيۡتُ لَهَا وَهِیَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذۡتُهَا ۚ﴾ (الحج:۴۸)

''اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے مہلت دی حالانکہ وہ ظالم تھیں پھر ہم نے انہیں اپنی پکڑ میں لے لیا۔''

اور فرمایا:

﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ لَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّلَا يَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ۝﴾ (الاعراف:۷'النحل:۶۱)

''پھر جب ان کی مدت مقررہ پوری ہو جاتی ہے تو پھر اس میں نہ ہی ایک ساعت کی تاخیر ہوتی ہے اور نہ ہی ایک ساعت پہلے ہوتی ہے۔''

یہی معنی سورۃ السجدۃ کی اس آیت کا ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کے ایک دن کو دنیوی اعتبار سے ایک ہزار سال کے برابر کہا گیا ہے' کہ زمین و آسمان کے مابین کی طویل مسافت اللہ تعالیٰ کے کاموں کے واقع ہونے میں حائل نہیں ہوتی' اور یہی کام اگر اللہ تعالیٰ تمہارے سپرد کر ڈالتے تو تم اپنی استعداد کے مطابق اس کے کرنے میں ایک ایک ہزار سال لگا سکتے تھے۔

جہاں تک سورۃ المعارج کی آیت کا تعلق ہے تو وہاں قیامت کا دن مراد ہے کہ جس میں تمام مخلوقات کا حساب و کتاب ہوگا' ان کے اعمال کا وزن کیا جائے گا' ان کے فیصلے سنائے جائیں گے' یہاں تک کہ اہلِ جنت' اپنی جنتوں میں اور اہل النار' جہنم تک پہنچ جائیں گے۔ اور اگر پھر اس ساری کارروائی کا حساب لیا جائے اور کارروائی بھی کوئی معمولی نہیں بلکہ اس میں بڑی ہولناکی بھی شامل ہے اور اس کا دنیوی ماہ و سال سے موازنہ کیا جائے تو وہ کہیں جا کے پچاس ہزار سال کے برابر بنتا ہے' لیکن ایک متقی مؤمن کے لیے وہ دن اتنا ہلکا ہوگا گویا کہ وہ ایک نماز کی ادائیگی کے برابر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوۡرِ ۝۸ فَذٰلِكَ يَوۡمَئِذٍ يَّوۡمٌ عَسِيۡرٌ ۝۹ عَلَی الۡكٰفِرِيۡنَ غَيۡرُ يَسِيۡرٍ ۝۱۰﴾ (المدثر)

''اور پھر جب صور میں پھونکا جائے گا' تو وہ دن بہت سخت ہوگا' اور کافروں پر وہ آسان نہ ہوگا۔''

سورۃ المعارج میں مذکور یہ دن قیامت کا دن ہے کہ اس کے فوراً بعد اس کا وصف بیان کیا گیا ہے جو قیامت کے دن کے اوصاف میں سے ہے:

﴿يَوۡمَ تَكُوۡنُ السَّمَآءُ كَالۡمُهۡلِ ۝۸ وَتَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ ۝۹ وَلَا يَسۡـَٔلُ حَمِيۡمٌ حَمِيۡمًا ۝۱۰ يُّبَصَّرُوۡنَهُمۡ ؕ يَوَدُّ الۡمُجۡرِمُ لَوۡ يَفۡتَدِیۡ مِنۡ عَذَابِ يَوۡمِئِذٍۭ بِبَنِيۡهِ ۝۱۱ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيۡهِ ۝۱۲ وَفَصِيۡلَتِهِ الَّتِیۡ تُـْٔوِيۡهِ ۝۱۳ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ۙ ثُمَّ يُنۡجِيۡهِ ۝۱۴﴾

''کہ جس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کے مثل ہو جائے گا.....''

(اور پھر اگلی چھ آیات تک اس دن کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔) واللہ اعلم!

(۲۶۱) آیت ۵۰

﴿فَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ كَرِيۡمٌ ۝۵۰﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے' ان کے لیے مغفرت اور اچھا رزق ہے۔''

پھر چند آیات کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿اَلۡمُلۡكُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ ؕ فَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِىۡ جَنّٰتِ النَّعِيۡمِ ۞﴾

’’اُس دن بادشاہت اللہ کی ہوگی، وہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ تو پھر جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے وہ نعمتوں سے بھرپور جنتوں میں ہوں گے۔‘‘

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں جگہ ایمان اور عمل صالح رکھنے والے لوگوں کا ذکر ہے لیکن جزا کا ذکر مختلف الفاظ سے کیا گیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں آیتوں کا ماسبق مختلف ہے، پہلی آیت سے ماقبل ’’یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ‘‘ کہہ کر لوگوں کو مخاطب کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ ﴿اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمۡ نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ﴾ کہ میں تمہاری طرف کھلا کھلا خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور اگر تم ایمان لے آتے ہو اور نیک اعمال کرتے ہو تو تم نے جتنی بھی نافرمانیاں اور مخالفتیں کی ہیں وہ سب کی سب معاف کر دی جائیں گی اور تمہیں رزقِ کریم سے نوازا جائے گا۔ جہاں تک دوسری آیت کا تعلق ہے تو وہاں دُنیوی زندگی ختم ہو جانے اور اُخروی زندگی کی آمد کا تذکرہ ہے کہ ایمان لانے اور نیک اعمال کا بدلہ ملنے کا وقت ہے، یعنی جس مغفرت اور رزقِ کریم کا وعدہ کیا گیا تھا وہ جنت کی ابدی نعمتوں کی شکل میں ملے گا۔

حاصل مضمون یہ ہوا کہ پہلی آیت سے قبل ’’یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ‘‘ کا خطاب ہی بتا رہا ہے کہ ابھی ان لوگوں کو ایمان حاصل نہیں ہوا تھا ورنہ انہیں ’’یٰۤاَیُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا‘‘ کہہ کر خطاب کیا جاتا، اور پھر انہیں ایمان لانے اور عمل صالح کرنے کے صلہ میں ایک بشارت دی گئی۔ اور دوسری آیت میں اسی بشارت کی حقیقت کو واضح کیا گیا کہ یہ رزقِ کریم اور نعمتوں سے بھرپور باغات کی شکل میں ہوگا۔ اس لحاظ سے ہر آیت اپنی اپنی جگہ پر اپنے مضمون کے ساتھ خوب مناسبت رکھتی ہے۔ واللہ اعلم!

(۲۶۲) آیت ۶۲

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ هُوَ الۡبَاطِلُ﴾

’’یہ اس لیے کہ اللہ ہی حق ہے اور اسے چھوڑ کر وہ جن کو پکارتے ہیں وہی باطل ہے۔‘‘

اور سورۃ لقمان میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنَّ مَا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِ الۡبَاطِلُ﴾ (آیت ۳۰)

’’اور اس کے سوا جس جس کو وہ پکارتے ہیں وہ باطل ہے۔‘‘

یہاں سوال کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ پہلی آیت میں ’’الۡبَاطِلُ‘‘ سے پہلے ’’هُوَ‘‘ کا اضافہ ہے جب کہ دوسری آیت میں وہی مضمون ہے لیکن وہاں ’’هُوَ‘‘ نہیں لایا گیا تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواباً عرض ہے کہ سورۃ الحج میں معبودانِ باطل کا بار بار تذکرہ ہوا ہے، اس لیے ضروری تھا کہ ’’هُوَ‘‘ کی ضمیر لا کر ان کے کرتوتوں کی نفی کی جاتی، کیونکہ ضمیر کی تکرار سے کسی امر کی تاکید مراد ہوتی ہے، چاہے یہ ضمیر شروع میں

بطور مبتدا آئے یا کلام کے دوران بطور فصل آئے۔

ملاحظہ ہو کہ آیت ۳۱ میں ان کے شرک کی بے حیثیتی کا یوں تذکرہ کیا گیا تھا:

﴿وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ اَوۡ تَهۡوِىۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِىۡ مَكَانٍ سَحِيۡقٍ ۝۳۱﴾

''اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے' گویا وہ آسمان سے گرتا ہے تو پرندے اس کو اُچک لیتے ہیں یا ہوا اسے ایک گہری کھائی میں جا گراتی ہے۔''

اور سورت کے آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَنۡ يَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّلَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَهٗ ؕ وَاِنۡ يَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ شَيۡئًا لَّا يَسۡتَنۡقِذُوۡهُ مِنۡهُ ؕ﴾ (آیت ۷۳)

''بے شک جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ سب مل کر بھی ایک مکھی تک پیدا نہیں کر سکتے' اور اگر وہ مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے واپس تک نہیں لے سکتے۔''

ملاحظہ ہو کہ آیت ۶۲ میں یہ بات کہی گئی تھی: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ هُوَ الۡبَاطِلُ﴾ اور اس آیت میں مشرکین کے دیوتاؤں' جن کا تذکرہ آیت ۳۱ میں آ چکا تھا' کا تذکرہ ہے کہ وہ سب باطل ہیں' ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے' جب کہ اللہ ہی حق ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔

پھر آیت ۷۳ میں شرک کی شناعت کا اظہار مکھی کی مثال سے کیا گیا اور اس کے بعد فرمایا گیا:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖ ؕ﴾ (آیت ۷۴)

''اور انہوں نے اللہ کے قدر و منزلت کو پہچانا ہی نہیں۔''

ان دونوں آیتوں میں شرک کے قبیح ہونے کا بیان ہوا اور دونوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے حق ہونے کی تاکید کی گئی۔ گو آیت ۳۱ میں شرک کی ناقدری کا ذکر ہو چکا تھا لیکن آیت ۷۳ سے اسے مزید نکھارا گیا۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ مکھی کی مثال جو شرک کی بے بضاعتی پر دلالت کرتی ہے وہ تو بعد میں ہے' تو آیت ۶۲ کا تعلق اس آیت سے کیسے ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فصیح و بلیغ کلام میں اس طرح کی تقدیم و تاخیر روا رکھی گئی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ البقرۃ میں جہاں ایک گائے کے ذبح کرنے کا واقعہ بیان ہوا ہے' وہاں یہ آیت لائی گئی:

﴿وَاِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا فَادّٰرَءۡتُمۡ فِيۡهَا ؕ﴾ (آیت ۷۲)

''اور جب تم نے ایک جان کو قتل کیا پھر تم نے اس کے بارے میں اختلاف کیا۔''

یہاں اشارہ ہے اس قصے کی طرف جو اس آیت سے پہلے بیان ہو چکا ہے اور جس کی ابتدا آیت ۶۷ سے ہو چکی تھی:

﴿وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُكُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَةً ؕ﴾ (آیت ۶۷)

''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے کو ذبح کرو۔''

ان دونوں آیتوں کو اگر جمع کیا جائے تو کلام یوں ہوگا کہ: ''جب تم نے ایک جان کو قتل کیا اور پھر تم نے (قاتل) کے بارے میں اختلاف کیا تو موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے کو ذبح کرو'' اور پھر آیت ۷۲ میں بتادیا کہ قاتل کو جاننے کے لیے تمہیں کیا کرنا ہوگا۔

ایسا ہی کچھ سورۃ الحج کی آیات میں بھی ہے کہ گو ایک آیت جس میں مکھی کی مثال دی گئی ہے' بعد میں آئی ہے' اس کا تعلق ﴿وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ﴾ والی آیت سے ہے' اور دونوں کے مقابلے میں پھر اللہ کی حقانیت پر مشتمل آیت ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡحَقُّ ....﴾ لائی گئی۔ اس تقدیم و تاخیر کو فصحاءِ عرب خوب سمجھتے ہیں اور جو نہ سمجھے وہ خود قصورِ فہم کا شکار ہے۔

سورۂ لقمان میں چونکہ شرک کے بارے میں یہ وضاحتی بیان نہیں تھا اس لیے وہاں ''الۡبَاطِل'' سے پہلے بطور تاکید ''هُوَ'' کی ضمیر نہیں لائی گئی۔ اور جہاں تک سورۃ الحج کی آیت کے اعراب کا تعلق ہے تو اس ضمیر کو مبتدأ بھی مانا جاسکتا ہے یا اسے ضمیر فصل کے طور پر لیا جائے گا۔ واللہ اعلم!

(۲۶۳) آیت ۶۴

﴿لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ ﴿۶۴﴾﴾

''اور اُسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور بے شک اللہ بے نیاز ہے' قابلِ تعریف ہے۔''

اور سورۂ لقمان میں ارشاد فرمایا:

﴿لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ ﴿۲۶﴾﴾

''اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ بے شک اللہ ہی بے نیاز ہے اور لائقِ حمد و ثنا ہے۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلی آیت میں سورۃ لقمان کی آیت کے مقابلے میں دو حرف زیادہ ہیں' ایک تو حرف ''مَا'' ''الۡاَرۡضِ'' سے پہلے اور ایک ''هُوَ'' سے قبل لامِ تاکید جو کہ اِنَّ سے شروع ہونے والے جملے کی خبر ہے' تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب پچھلے مضمون میں آچکا ہے کہ سورۃ الحج میں سورۃ لقمان کے مقابلے میں تاکیدی الفاظ آئے ہیں' ان دونوں جگہ پر بھی ''مَا'' موصولہ کی تکرار (فِى الۡاَرۡضِ سے قبل) اور هُوَ پر لام دونوں تاکید کی غرض سے لائے گئے ہیں' واللہ اعلم!

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی ونحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان مرحوم

سُورۃُ النَّحل

آیات ۳۰ تا ۳۴

﴿وَقِيۡلَ لِلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا مَاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّكُمۡ‌ؕ قَالُوۡا خَيۡرًا‌ؕ لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِىۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا
حَسَنَةٌ‌ ؕ وَلَدَارُ الۡاٰخِرَةِ خَيۡرٌ‌ ؕ وَلَنِعۡمَ دَارُ الۡمُتَّقِيۡنَ ۝۳۰ جَنّٰتُ عَدۡنٍ يَّدۡخُلُوۡنَهَا تَجۡرِىۡ مِنۡ
تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ‌ لَهُمۡ فِيۡهَا مَا يَشَآءُوۡنَ‌ ؕ كَذٰلِكَ يَجۡزِى اللّٰهُ الۡمُتَّقِيۡنَ ۝۳۱ الَّذِيۡنَ تَتَوَفّٰٮهُمُ
الۡمَلٰۤـئِكَةُ طَيِّبِيۡنَ‌ ۙ يَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمُ ادۡخُلُوا الۡجَـنَّةَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ‏ ۝۳۲ هَلۡ
يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِيَهُمُ الۡمَلٰۤـئِكَةُ اَوۡ يَاۡتِىَ اَمۡرُ رَبِّكَ‌ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ ؕ وَمَا
ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ‏ ۝۳۳ فَاَصَابَهُمۡ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوۡا وَحَاقَ بِهِمۡ
مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝۳۴﴾

ترکیب

(آیت ۳۰) خَیْرًا کی نصب بتا رہی ہے کہ اس سے پہلے اس کا فعل اَنْزَلَ محذوف ہے۔ حَسَنَۃٌ مبتدأ مؤخر نکرہ ہے۔ اس کی خبر وَاجِبٌ یا ثَابِتٌ محذوف ہے۔ اس کے آگے ایک گنجائش یہ ہے کہ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا کو قائم مقام خبر مقدم مانیں اور فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا کو متعلق خبر مانیں۔ ایسی صورت میں جملہ ہوگا: اَلْحَسَنَۃُ وَاجِبٌ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا۔ دوسری گنجائش یہ ہے کہ فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا کو قائم مقام خبر مانیں اور لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا کو متعلق خبر مانیں۔ ایسی صورت میں جملہ ہوگا: اَلْحَسَنَۃُ وَاجِبٌ فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا۔ اگلی عبارت وَلَدَارُ الْاٰخِرَۃِ خَیْرٌ کا تقاضا ہے کہ دوسری گنجائش کو ترجیح دی جائے۔

ترجمہ:

وَقِيْلَ: اور (جب) کہا جاتا ہے
اتَّقَوْا: تقویٰ اختیار کیا
رَبُّكُمْ: تمہارے رب نے
خَيْرًا: (اس نے اتارا) بہترین کو
اَحْسَنُوْا: بلاکم وکاست کام کیا
حَسَنَةٌ: ایک بھلائی ہے
خَيْرٌ: سب سے بہتر ہے
دَارُ الْمُتَّقِيْنَ: تقویٰ کرنے والوں کا گھر
يَدْخُلُوْنَهَا: وہ داخل ہوں گے ان میں
مِنْ تَحْتِهَا: ان کے نیچے سے
لَهُمْ فِيْهَا: ان کے لیے ہے ان میں
كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ: اس طرح بدلہ دے گا اللہ
الَّذِيْنَ: وہ لوگ
الْمَلٰٓئِكَةُ: فرشتے
يَقُوْلُوْنَ: وہ (فرشتے) کہیں گے
عَلَيْكُمْ: تم لوگوں پر
الْجَنَّةَ: جنت میں
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: تم لوگ عمل کرتے تھے
اِلَّآ اَنْ: سوائے اس کے کہ
الْمَلٰٓئِكَةُ: فرشتے
اَمْرُ رَبِّكَ: آپ کے رب کا حکم
فَعَلَ: کیا
مِنْ قَبْلِهِمْ: ان سے پہلے تھے
اللّٰهُ: اللہ نے
كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ: وہ لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے

لِلَّذِيْنَ: ان سے جنہوں نے
مَاذَآ اَنْزَلَ: کیا اتارا
قَالُوْا: تو وہ کہتے ہیں
لِلَّذِيْنَ: ان کے لیے جنہوں نے
فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا: اس دنیا میں
وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ: اور یقیناً آخرت کا گھر (تو)
وَلَنِعْمَ: اور یقیناً کتنا اچھا ہے
جَنّٰتُ عَدْنٍ: عدن کے باغات ہیں
تَجْرِيْ: بہتی ہیں
الْاَنْهٰرُ: نہریں
مَا يَشَآءُوْنَ: جو وہ چاہیں گے
الْمُتَّقِيْنَ: تقویٰ کرنے والوں کو
تَتَوَفّٰىهُمُ: جان قبض کرتے ہیں جن کی
طَيِّبِيْنَ: خوشگوار حالت میں
سَلٰمٌ: سلامتی ہے
ادْخُلُوا: (اب) داخل ہو جاؤ
بِمَا: بسبب اس کے جو
هَلْ يَنْظُرُوْنَ: کیا وہ لوگ انتظار کرتے ہیں
تَاْتِيَهُمُ: آئیں ان کے پاس
اَوْ يَاْتِيَ: یا پہنچے
كَذٰلِكَ: اسی طرح
الَّذِيْنَ: انہوں نے جو
وَمَا ظَلَمَهُمُ: اور ظلم نہیں کیا ان پر
وَلٰكِنْ: اور لیکن
فَاَصَابَهُمْ: تو پہنچیں ان کو

سَیِّاٰتُ مَا : اس کی برائیاں جو   عَمِلُوْا : انہوں نے عمل کیا

وَحَاقَ بِهِمْ مَّا : اور چھا گیا ان پر وہ   كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ : جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے

نوٹ: اس سورہ کی آیات ۲۸۔ ۲۹ میں اور پھر آیت ۳۲ میں ان لوگوں سے فرشتوں کی گفتگو کا ذکر ہے جن کی وہ روح قبض کرتے ہیں۔ یہ آیات قرآن مجید کی ان متعدد آیات میں سے ہیں جو عذاب وثوابِ قبر کا ثبوت دیتی ہیں۔ حدیث میں قبر کا لفظ مجازاً عالَمِ برزخ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد وہ عالَم ہے جس میں موت کی آخری ہچکی سے لے کر بعث بعد الموت کے پہلے جھٹکے تک انسانی ارواح رہیں گی۔ منکرینِ حدیث کو اس پر اصرار ہے کہ یہ عالَم بالکل عدمِ محض کا عالَم ہے جس میں کوئی احساس وشعور نہ ہوگا اور کسی قسم کا عذاب یا ثواب نہ ہوگا۔ لیکن یہاں دیکھئے کہ کُفّار کی روحیں جب قبض کی جاتی ہیں تو وہ موت کی سرحد کے پار کا حال اپنی توقعات کے خلاف پا کر سراسیمہ ہو جاتی ہیں اور فوراً سلام ٹھونک کر ملائکہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتی ہیں کہ ہم کوئی برا کام نہیں کر رہے تھے۔ جواب میں ملائکہ ان کو جہنم کی پیشگی خبر دیتے ہیں۔ دوسری طرف متقی لوگوں کی روحیں جب قبض کی جاتی ہیں تو ملائکہ ان کو سلام کرتے ہیں اور جنتی ہونے کی پیشگی مبارک باد دیتے ہیں۔ کیا برزخ کی زندگی، احساس، شعور، عذاب اور ثواب کا اس سے بھی زیادہ کھلا ہوا کوئی ثبوت درکار ہے؟ سب سے زیادہ صاف الفاظ میں عذابِ برزخ کی تصریح سورۃ المؤمن کی آیات ۴۵، ۴۶ میں کی گئی ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرعون اور آلِ فرعون کے متعلق فرماتا ہے:

﴿وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾﴾ ''ایک سخت عذاب آلِ فرعون کو گھیرے ہوئے ہے۔ یعنی صبح و شام وہ آگ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، پھر جب قیامت کی گھڑی آ جائے گی تو حکم دیا جائے گا کہ آلِ فرعون کو شدید تر عذاب میں داخل کرو۔''

حقیقت یہ ہے کہ قرآن وحدیث، دونوں سے موت اور قیامت کے درمیان حالت کا ایک ہی نقشہ معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ موت محض جسم وروح کی علیحدگی کا نام ہے، نہ کہ بالکل معدوم ہو جانے کا۔ جسم سے علیحدہ ہو جانے کے بعد روح معدوم نہیں ہو جاتی بلکہ اس پوری شخصیت کے ساتھ زندہ رہتی ہے جو دنیا کی زندگی کے تجربات اور ذہنی واخلاقی اکتسابات سے بنی تھی۔ اس حالت میں روح کے شعور، احساس، مشاہدات اور تجربات کی کیفیت خواب سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۵۳۶)

آیات ۳۵ تا ۴۰

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ

مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ
نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا
وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَاۤ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾

ترجمہ:

وَقَالَ : اور کہیں گے	الَّذِيْنَ : وہ لوگ جنہوں نے
اَشْرَكُوْا : شرک کیا	لَوْ شَآءَ اللّٰهُ : اگر چاہتا اللہ
مَا عَبَدْنَا : تو ہم بندگی نہ کرتے	مِنْ دُوْنِهٖ : اُس کے علاوہ
مِنْ شَيْءٍ : کسی بھی چیز کی	نَّحْنُ : (نہ) ہم
وَلَآ اٰبَآؤُنَا : اور نہ ہی ہمارے آباء واَجداد	وَلَا حَرَّمْنَا : اور ہم حرام نہ کرتے
مِنْ دُوْنِهٖ : اس کے (حکم کے) علاوہ	مِنْ شَيْءٍ : کسی بھی چیز کو
كَذٰلِكَ : اسی طرح	فَعَلَ الَّذِيْنَ : کیا انہوں نے جو
مِنْ قَبْلِهِمْ : ان سے پہلے تھے	فَهَلْ : تو کیا ہے
عَلَى الرُّسُلِ : رسولوں پر	اِلَّا : سوائے اس کے کہ
الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ : واضح طور پر پہنچا دینا	وَلَقَدْ بَعَثْنَا : اور یقیناً ہم نے بھیجا ہے
فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ : ہر ایک اُمت میں	رَّسُوْلًا : ایک رسول
اَنِ اعْبُدُوا : کہ تم لوگ بندگی کرو	اللّٰهَ : اللہ کی
وَاجْتَنِبُوا : اور تم لوگ بچو	الطَّاغُوْتَ : سرکشی کے ذریعوں سے
فَمِنْهُمْ مَّنْ : تو ان میں وہ بھی ہیں جن کو	هَدَى اللّٰهُ : ہدایت دی اللہ نے
وَمِنْهُمْ مَّنْ : اور ان میں وہ بھی ہے	حَقَّتْ : ثابت ہوئی
عَلَيْهِ : جس پر	الضَّلٰلَةُ : گمراہی
فَسِيْرُوْا : پس تم چلو پھرو	فِي الْاَرْضِ : زمین میں
فَانْظُرُوْا : پھر دیکھو	كَيْفَ كَانَ : کیسا تھا
عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ : جھٹلانے والوں کا انجام	اِنْ تَحْرِصْ : اگر آپؐ شدید خواہش کریں
عَلٰى هُدٰىهُمْ : ان لوگوں کی ہدایت پر	فَاِنَّ اللّٰهَ : تو بے شک اللہ
لَا يَهْدِيْ : نہیں ہدایت دیتا	مَنْ يُّضِلُّ : اس کو جس کو وہ گمراہ کرتا ہے

وَمَا لَهُمْ : اور ان کے لیے نہیں ہے	مِّنْ نّٰصِرِيْنَ : کوئی بھی مدد کرنے والا
وَاَقْسَمُوْا : اور انہوں نے قسم کھائی	بِاللّٰهِ : اللہ کی
جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ : اپنی قسموں کا زور لگاتے ہوئے	لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ : نہیں اٹھائے گا اللہ
مَنْ يَّمُوْتُ : اس کو جو بے جان ہوتا ہے	بَلٰى : کیوں نہیں
وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا : اس پر ہے سچا وعدہ	وَّلٰكِنَّ : اور لیکن
اَكْثَرَ النَّاسِ : لوگوں کے اکثر	لَا يَعْلَمُوْنَ : جانتے نہیں ہیں
لِيُبَيِّنَ : تاکہ وہ واضح کر دے	لَهُمُ الَّذِيْ : ان کے لیے جو
يَخْتَلِفُوْنَ : اختلاف کرتے ہیں	فِيْهِ : اس (اٹھائے جانے) میں
وَلِيَعْلَمَ : اور تاکہ جان لیں	الَّذِيْنَ : وہ لوگ جنہوں نے
كَفَرُوْٓا : انکار کیا	اَنَّهُمْ : کہ وہی
كَانُوْا كٰذِبِيْنَ : جھوٹے تھے	اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ
قَوْلُنَا : ہمارا کہنا ہے	لِشَيْءٍ : کسی چیز کے لیے
اِذَآ اَرَدْنٰهُ : جب بھی ہم ارادہ کرتے ہیں اس کا	اَنْ نَّقُوْلَ : کہ ہم کہتے ہیں
لَهٗ : اس سے	كُنْ : ہو جا
فَيَكُوْنُ : تو وہ ہو جاتی ہے	

نوٹ: آیت ۳۵ میں کہا گیا ہے کہ واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا رسولوں پر اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہی بات ایک دوسرے پیرائے میں اس طرح کہی گئی ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو صرف خوشخبری دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے (الفرقان:۵۶)۔ قرآن مجید میں ان دونوں اسلوب کی اور بھی آیات ہیں۔ ایسی آیات کی بنیاد پر منکرینِ حدیث استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا کام صرف یہ تھا کہ وہ قرآن پہنچا دیں۔ حالانکہ منکرینِ حدیث خود کو اہلِ قرآن کہتے ہیں، لیکن یہ استدلال بتا رہا ہے کہ قرآن مجید کا پوری طرح مطالعہ نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ قرآن مجید کے بہت سے وضاحت طلب امور کی وضاحت خود قرآن میں موجود ہے اور اس مسئلہ کی بھی پوری وضاحت قرآن میں دی ہوئی ہے۔ اگر تمام متعلقہ آیات کو سامنے رکھ کر کوئی سمجھنا چاہے تو بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے جو درج ذیل ہے:

رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت یعنی مشن یہ تھا کہ وہ اللہ کے دین کو پورے نظامِ حیات پر غالب کر دیں۔ قرآن مجید میں یہ بات اللہ تعالیٰ نے تین مرتبہ دہرائی ہے۔ (التوبۃ:۳۳، الفتح:۲۸، الصّف:۹)۔ اس مشن کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس طریقۂ کار کا تعین کیا تھا وہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتے تھے۔ یہ ابلاغ ہے اور اس میں انذار و تبشیر از خود شامل ہے۔ لوگوں کا تزکیہ کرتے تھے، کتاب کی تعلیم دیتے

تھے اور حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ آپ ﷺ کے ان فرائض چہارگانہ کا ذکر بھی قرآن میں چار ہی مرتبہ آیا ہے۔ (البقرۃ:۱۲۹ و ۱۵۱، آلِ عمران: ۱۶۴، الجمعۃ: ۲)۔ تعلیم کتاب کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم میں جو احکام و ہدایات ہیں اس سے اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے اور ان پر ہم نے کس طرح عمل کرنا ہے۔ یہ مطلب کسی کا خودساختہ نہیں ہے بلکہ اس کی سند قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ ﴾ (النحل: ۴۴) ''اور ہم نے نازل کیا آپؐ کی طرف اس ذکر کو تاکہ آپؐ واضح کر دیں لوگوں کے لیے اس کو جو نازل کیا گیا ان لوگوں کی طرف (یعنی قرآن)۔''

نہ صرف قرآن کے مذکورہ مقامات کو نظرانداز کیا گیا ہے بلکہ مذکورہ غلط استدلال جن آیات کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے، ان کے سیاق و سباق سے بھی اغماض برتا گیا ہے، کیونکہ ان کے سیاق و سباق سے پوری طرح واضح ہے کہ ان میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو ایمان لانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ابلاغ اور انذار و تبشیر کے بعد رسول اللہ ﷺ کا کام ختم ہو جاتا ہے اور ان سے اب آپؐ بریٔ الذمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تسلی دی ہے کہ دوزخ میں جانے والوں کے متعلق آپؐ سے نہیں پوچھا جائے گا (البقرۃ:۱۱۹)۔ لیکن جو لوگ ایمان لے آئے ان کے لیے آپؐ کا کام ختم نہیں ہوا بلکہ شروع ہوا تھا۔ ان کا تزکیہ کرنا، ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینا تاکہ وہ لوگ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جِدّوجُہد میں رسول اللہ ﷺ کے دست و بازو بنیں اور آپؐ کے مشن کی تکمیل ہو۔ اس سارے process کے قولی اور عملی ریکارڈ کا نام حدیث ہے اور یہ اہلِ ایمان کے لیے ہے۔

آیات ۴۱ تا ۴۴

﴿وَالَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا فِی اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا لَنُبَوِّئَنَّہُمۡ فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً ؕ وَلَاَجۡرُ الۡاٰخِرَۃِ اَکۡبَرُ ۘ لَوۡ کَانُوۡا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۱﴾ الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا وَعَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ﴿۴۲﴾ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَہۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۳﴾ بِالۡبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَلَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۴۴﴾﴾

ترکیب

(آیت ۴۱) لَنُبَوِّئَنَّ کا مفعول اول ھُمۡ کی ضمیر ہے اور اس کا مفعول ثانی محذوف ہے جو کہ دارًا ہو سکتا ہے۔ حَسَنَۃً اس کی صفت ہے۔ یَعۡلَمُوۡنَ کی ضمیر فاعلی، آیت ۳۹ میں مذکور کٰذِبِیۡنَ کے لیے ہے۔ (آیت ۴۲) اس پوری آیت کا فقرہ گزشتہ آیت میں مذکور وَالَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا کی صفت ہے۔ (آیت ۴۳) رِجَالًا نکرہ مخصوصہ ہے۔ اس کی پہلی خصوصیت نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ ہے اور دوسری خصوصیت بِالۡبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ہے۔ (آیت ۴۴) وَمَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ میں اِلَیۡہِمۡ دراصل لَھُمۡ کے معنی میں ہے۔

ترجمہ:

وَالَّذِيْنَ :اور وہ لوگ جنہوں نے — هَاجَرُوْا :ہجرت کی

فِي اللّٰهِ :اللہ (کی راہ) میں — مِنْۢ بَعْدِ مَا :اس کے بعد کہ جو

ظُلِمُوْا :ان پر ظلم کیا گیا — لَنُبَوِّئَنَّهُمْ :ہم لازماً ٹھکانہ دیں گے ان کو

فِي الدُّنْيَا :دنیا میں — حَسَنَةً :ایک اچھے (گھر) کا

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ :اور یقیناً آخرت کا بدلہ — اَكْبَرُ :سب سے بڑا ہے

لَوْ :کاش — كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ :وہ لوگ جانتے ہوتے

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا :(اور) جو ثابت قدم رہے — وَعَلٰى رَبِّهِمْ :اور اپنے ربّ پر ہی

يَتَوَكَّلُوْنَ :بھروسہ کرتے رہے — وَمَآ اَرْسَلْنَا :اور ہم نے نہیں بھیجا

مِنْ قَبْلِكَ :آپؐ سے پہلے — اِلَّا رِجَالًا :مگر کچھ مردوں کو

نُّوْحِيْٓ :ہم وحی کرتے تھے — اِلَيْهِمْ :جن کی طرف

فَسْئَلُوْٓا :پس تم لوگ پوچھو — اَهْلَ الذِّكْرِ :یاد دہانی والوں (یعنی اہلِ کتاب) سے

اِنْ :اگر — كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ :تم لوگ نہیں جانتے

بِالْبَيِّنٰتِ :(جن کو بھیجا) واضح (نشانیوں کے) ساتھ — وَالزُّبُرِ :اور صحیفوں کے ساتھ

وَاَنْزَلْنَآ :اور ہم نے اتارا — اِلَيْكَ :آپؐ کی طرف

الذِّكْرَ :اس یاددہانی کو — لِتُبَيِّنَ :تاکہ آپؐ واضح کریں

لِلنَّاسِ :لوگوں کے لیے — مَا :اس کو جو

نُزِّلَ :نازل کیا گیا — اِلَيْهِمْ :ان کی طرف (یعنی ان کے واسطے)

وَلَعَلَّهُمْ :اور شاید وہ لوگ — يَتَفَكَّرُوْنَ :غور وفکر کریں

نوٹ: آیت ۴۴ کے دوسرے جزو میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مامور فرمایا ہے کہ آپؐ قرآن کی نازل شدہ آیات کی وضاحت لوگوں کے سامنے کر دیں۔ یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کریم کے حقائق اور احکام کو صحیح طور پر سمجھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان پر موقوف ہے۔ اگر ہر انسان صرف عربی زبان اور عربی ادب سے واقف ہو کر قرآن کے احکام کو اللہ تعالیٰ کی منشاء و مرضی کے مطابق سمجھنے پر قادر ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضاحت کی خدمت سپرد کرنے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرآن کی وضاحت پر مامور ہونے کا حاصل یہ ہوا کہ آپؐ سے جو بھی قول و فعل ثابت

ہے وہ سب قرآن ہی کے ارشادات ہیں۔ بعض تو ظاہری طور پر کسی آیت کی تفسیر وتوضیح ہوتے ہیں اور بعض جگہ بظاہر قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا مگر آپؐ کے قلبِ مبارک میں بطورِ وحی اس کا القاء کیا جاتا ہے‘ وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے حکم میں ہوتا ہے‘ کیونکہ قرآن کی تصریح کے مطابق آپؐ کی کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔ (النجم: ۳‘۴) اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کی تمام عبادات و معاملات بوحیٔ خداوندی اور بحکمِ قرآن ہیں۔ جہاں کہیں آپ ﷺ نے اپنے اجتہاد سے کوئی کام کیا ہے تو وحی الٰہی سے یا اس پر کوئی نکیر نہ کرنے سے اس کی تصحیح اور پھر تائید کر دی جاتی ہے‘ اس لیے وہ بھی بحکمِ وحی ہو جاتا ہے۔ (معارف القرآن)

آیات ۴۵ تا ۵۰

﴿اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۶﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۷﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۰﴾﴾

خ س ف

خَسَفَ يَخْسِفُ (ض) خُسُوْفًا : کسی جگہ کا دھنس جانا (لازم)۔ کسی کو دھنسا دینا (متعدّی)۔ زیرِ مطالعہ آیت ۴۵۔

د خ ر

چاند کو گہن لگنا۔ (القیامۃ: ۸)

دَخَرَ يَدْخَرُ (ف) وَدَخِرَ يَدْخَرُ (س) دَخَرًا : ذلیل ہونا‘ حقیر ہونا۔

دَاخِرٌ (اسم الفاعل) : ذلیل وحقیر ہونے والا۔ زیرِ مطالعہ آیت ۴۸۔

ترجمہ:

اَفَاَمِنَ : تو کیا امن میں ہوئے
الَّذِيْنَ : وہ لوگ جنہوں نے
مَكَرُوا : خفیہ تدبیر کی
السَّيِّاٰتِ : برائیوں کے لیے
اَنْ يَّخْسِفَ : کہ دھنسا دے
اللّٰهُ : اللہ
بِهِمُ الْاَرْضَ : ان کے ساتھ زمین کو
اَوْ يَاْتِيَهُمْ : یا پہنچے ان کے پاس

الْعَذَابُ: عذاب

لَا يَشْعُرُوْنَ: وہ شعور (بھی) نہ رکھتے ہوں

فِيْ تَقَلُّبِهِمْ: ان کے گھومنے پھرنے میں

بِمُعْجِزِيْنَ: عاجز کرنے والے

عَلٰى تَخَوُّفٍ: خوف زدہ ہونے کے باوجود

رَبَّكُمْ: تمہارا ربّ

رَّحِيْمٌ: ہر حال میں رحم کرنے والا ہے

اِلٰى مَا: اس کی طرف جو

مِنْ شَيْءٍ: کوئی بھی چیز

ظِلٰلُهٗ: ان کے سائے

وَالشَّمَآئِلِ: اور بائیں طرفوں سے

لِّلّٰهِ: اللہ کے لیے

دٰخِرُوْنَ: حقیر ہونے والے ہوتے ہیں

يَسْجُدُ: سجدہ کرتا ہے

وَمَا فِي الْاَرْضِ: اور وہ جو زمین میں ہے

وَّالْمَلٰٓئِكَةُ: اور فرشتے (بھی)

لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ: بڑائی نہیں چاہتے

رَبَّهُمْ: اپنے ربّ سے

وَيَفْعَلُوْنَ: اور وہ کرتے ہیں

مِنْ حَيْثُ: جہاں سے

اَوْ يَاْخُذَهُمْ: یا یہ کہ وہ (یعنی اللہ) پکڑے ان کو

فَمَا هُمْ: پھر وہ لوگ نہ ہوں

اَوْ يَاْخُذَهُمْ: یا یہ کہ وہ پکڑے ان کو

فَاِنَّ: تو بے شک

لَرَءُوْفٌ: یقیناً بے انتہا شفقت کرنے والا ہے

اَوَلَمْ يَرَوْا: اور کیا انہوں نے غور ہی نہیں کیا

خَلَقَ اللّٰهُ: پیدا کیا اللہ نے

يَّتَفَيَّؤُا: (کہ) ڈھلتے ہیں

عَنِ الْيَمِيْنِ: داہنی طرف سے

سُجَّدًا: سجدہ کرنے والے ہوتے ہوئے

وَهُمْ: اور وہ سب

وَلِلّٰهِ: اور اللہ کے لیے ہی

مَا فِي السَّمٰوٰتِ: وہ جو آسمانوں میں ہے

مِنْ دَآبَّةٍ: کوئی بھی چلنے والا

وَهُمْ: اور وہ سب

يَخَافُوْنَ: وہ ڈرتے ہیں

مِّنْ فَوْقِهِمْ: اپنے اوپر سے

مَا يُؤْمَرُوْنَ: وہ جو انہیں حکم دیا جاتا ہے

آیات ۵۱ تا ۵۶

﴿ وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿٥١﴾ وَلَهٗ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ
ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿٥٣﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ
بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٤﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا
لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿٥٦﴾ ﴾

و ص ب

وَصَبَ یَصِبُ (ض) وُصُوْبًا : دائمی ہونا' لازم ہونا۔

وَاصِبٌ (فَاعِلٌ کے وزن پر صفت) : دائمی' لازمی۔ زیر مطالعہ آیت ۵۲۔

ج ء ر

جَأَرَ یَجْأَرُ (ف) جَأْرًا : وحشی جانور کا گھبراہٹ میں زور سے آواز نکالنا۔ چلانا' گڑگڑانا۔ زیر مطالعہ آیت ۵۳۔

ترکیب

(آیت ۵۲) اَفَغَیْرَ کی نصب بتارہی ہے کہ یہ تَتَّقُوْنَ کا مفعول مقدم ہے۔ (آیت ۵۴) فَرِیْقٌ اسم جمع ہے اس لیے بِرَبِّھِمْ میں جمع کی ضمیر اور یُشْرِکُوْنَ جمع کے صیغے میں آیا ہے۔ (آیت ۵۵) لِیَکْفُرُوْا کے لام کو لامِ کَیْ کے بجائے لامِ عاقبت ماننا زیادہ بہتر ہے۔ تَمَتَّعُوْا میں دو امکانات ہیں۔ یہ فعل ماضی میں جمع مذکر غائب کا صیغہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور فعل امر میں جمع مذکر مخاطب کا صیغہ بھی ہوسکتا ہے۔ آگے تَعْلَمُوْنَ آیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ فعل امر ہے۔ اگر یَعْلَمُوْنَ آتا تو پھر اسے فعل ماضی مانا جاتا۔

ترجمہ:

وَقَالَ اللّٰہُ : اور کہا اللہ نے	لَا تَتَّخِذُوْٓا : تم لوگ مت بناؤ
اِلٰھَیْنِ اثْنَیْنِ : دو الٰہ	اِنَّمَا ھُوَ : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ
اِلٰہٌ وَّاحِدٌ : واحد الٰہ ہے	فَاِیَّایَ : پس صرف مجھ سے ہی
فَارْھَبُوْنِ : پھر خوف کرو میرا	وَلَہٗ مَا : اور اُسی کا ہے وہ جو
فِی السَّمٰوٰتِ : آسمانوں میں ہے	وَالْاَرْضِ : اور زمین میں ہے
وَلَہُ : اور اُسی کے لیے ہے	الدِّیْنُ : مکمل نظامِ حیات
وَاصِبًا : لازمی ہوتے ہوئے	اَفَغَیْرَ اللّٰہِ : تو کیا اللہ کے علاوہ (کسی) سے
تَتَّقُوْنَ : تم لوگ ڈرتے ہو	وَمَا بِکُمْ : اور جو تمہارے لیے ہے
مِّنْ نِّعْمَۃٍ : کوئی بھی نعمت	فَمِنَ اللّٰہِ : تو (وہ) اللہ (کے پاس) سے ہے
ثُمَّ اِذَا : پھر جب بھی	مَسَّکُمُ : چھوتی ہے تمہیں
الضُّرُّ : سختی	فَاِلَیْہِ : تو اس کی طرف ہی
تَجْئَرُوْنَ : تم لوگ گڑگڑاتے ہو	ثُمَّ اِذَا : پھر جب بھی
کَشَفَ الضُّرَّ : وہ ہٹاتا ہے سختی کو	عَنْکُمْ : تم لوگوں سے
اِذَا فَرِیْقٌ : تب ہی ایک فریق	مِّنْکُمْ : تم میں سے

بِرَبِّهِمْ : اپنے ربّ کے ساتھ	يُشْرِكُوْنَ : شریک ٹھہراتے ہیں
لِيَكْفُرُوْا : نتیجتاً وہ ناشکری کرتے ہیں	بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ : اس کی جو ہم نے دیا ان کو
فَتَمَتَّعُوْا : تو تم لوگ فائدہ اٹھالو	فَسَوْفَ : پھر عنقریب
تَعْلَمُوْنَ : تم لوگ جان لو گے	وَيَجْعَلُوْنَ : اور وہ بناتے ہیں
لِمَا : اس کے لیے جس کا	لَا يَعْلَمُوْنَ : وہ لوگ علم نہیں رکھتے
نَصِيْبًا مِّمَّا : ایک حصہ اس میں سے جو	رَزَقْنٰهُمْ : ہم نے روزی دی ان کو
تَاللّٰهِ : اللہ کی قسم	لَتُسْـَٔلُنَّ : تم لوگوں سے لازماً پوچھا جائے گا
عَمَّا : اس کے بارے میں جو	كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ : تم لوگ گھڑا کرتے تھے

نوٹ: آیت ۵۶ میں ''لَا يَعْلَمُوْنَ'' کے حقیقی مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ذہن میں کچھ باتیں واضح ہونا ضروری ہیں۔ مادہ ''ع ل م'' سے مختلف اسماء وافعال قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں اور یہ زیادہ تر لغوی مفہوم کے بجائے اصطلاحی مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں ''علم'' ایسی معلومات کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے اپنے انبیاء ورسل علیہم السلام کو دی ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ﴾ (البقرۃ:۱۴۵) ''اور اگر آپؐ نے پیروی کی ان لوگوں کی خواہشات کی اس کے بعد کہ جو آپؐ کے پاس آیا علم میں سے۔'' اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء ورسل علیہم السلام کو جو کچھ بتایا ہے اور بتانا ہے اس میں سے کچھ آیا ہے، باقی ابھی آنا ہے۔

اسی طرح سے قرآن میں جہاں کہیں علم کی نفی آئی ہے بالعموم وہاں مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی بات جس کی کوئی سند سابقہ انبیاء ورسل علیہم السلام کی تعلیمات میں اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات یعنی قرآن وحدیث میں موجود نہ ہو۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ ﴾ (بنی اسرائیل:۳۶) ''اور تو پیچھے مت پڑ اس کے تیرے لیے جس کا کوئی علم نہیں ہے۔'' ﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴾ (لقمٰن:۱۵) ''اور اگر وہ دونوں یعنی والدین تجھ سے جہاد کریں اس پر کہ تُو شریک ٹھہرائے میرے لیے، نہیں ہے تیرے لیے جس کا کوئی علم، تو ان کی اطاعت مت کر۔'' یہ اور ایسے متعدد مقامات پر علم نہ ہونے کا مطلب ہے قرآن وحدیث میں سند نہ ہونا۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر یہ لفظ اصطلاحی کے بجائے لغوی مفہوم میں بھی آیا ہے۔ جیسے قارون کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ ﴾ (القصص:۷۸) ''کچھ نہیں سوائے اس کے کہ مجھے ملا ہے یہ ایک علم کی بنیاد پر جو میرے پاس ہے۔'' یہاں علم کا مطلب ہے تجربہ اور مہارت یعنی ہنرمندی۔ کوئی اگر آیت کے سیاق وسباق کو نظر میں رکھے تو وہ آسانی سے تمیز کرسکتا ہے کہ کہاں یہ لفظ لغوی مفہوم میں آیا ہے۔

اس لحاظ سے آیت ۵۶ کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان شکرانے‘ نذر ونیاز اور چڑھاوے میں غیر اللہ کے لیے جو حصہ مقرر کر لیتا ہے‘ ان ہستیوں کے وجود اور صفات کی اس کے پاس قرآن وحدیث میں کوئی سند نہیں ہے۔

آیات ۵۷ تا ۶۲

﴿ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ
وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ
اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ
وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ
عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً
وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ
الْحُسْنٰى ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾ ﴾

د س س

دَسَّ يَدُسُّ (ن) دَسًّا: کسی چیز کو کسی چیز کے نیچے چھپا دینا۔ کسی چیز میں ٹھونس دینا۔ زیر مطالعہ آیت ۵۹۔

ترجمہ:

وَيَجْعَلُوْنَ : اور وہ لوگ بناتے ہیں
لِلّٰهِ : اللہ کے لیے
الْبَنٰتِ : بیٹیاں
سُبْحٰنَهٗ : پاکیزگی اس کی ہے
وَلَهُمْ : اور ان کے لیے
مَّا يَشْتَهُوْنَ : وہ ہے جو وہ چاہتے ہیں
وَاِذَا : اور جب کبھی
بُشِّرَ : خوشخبری دی جاتی ہے
اَحَدُهُمْ : ان کے کسی ایک کو
بِالْاُنْثٰى : مؤنث (یعنی بیٹی) کی
ظَلَّ : تو ہو جاتا ہے
وَجْهُهٗ : اس کا چہرہ
مُسْوَدًّا : سیاہ
وَّهُوَ : اور وہ
كَظِيْمٌ : غم زدہ ہے
يَتَوَارٰى : وہ چھپتا ہے
مِنَ الْقَوْمِ : لوگوں سے
مِنْ سُوْٓءِ مَا : اس کی برائی (کے سبب) سے
بُشِّرَ بِهٖ : اس کو خوشخبری دی گئی جس کی
اَيُمْسِكُهٗ : چاہے وہ تھام لے اس کو
عَلٰى هُوْنٍ : رسوائی کے باوجود
اَمْ يَدُسُّهٗ : یا وہ دھنسا دے اس کو
فِى التُّرَابِ : مٹی میں
اَلَا سَآءَ : خبردار کتنا برا ہے
مَا يَحْكُمُوْنَ : وہ جو یہ لوگ فیصلہ کرتے ہیں
لِلَّذِيْنَ : ان کے لیے جو

لَا يُؤْمِنُوْنَ : ایمان نہیں لاتے	بِالْاٰخِرَةِ : آخرت پر
مَثَلُ السَّوْءِ : برائی کی مثال ہے	وَلِلّٰهِ : اور اللہ کے لیے
الْمَثَلُ الْاَعْلٰى : بلند ترین مثال ہے	وَهُوَ : اور وہی
الْعَزِيْزُ : بالادست ہے	الْحَكِيْمُ : حکمت والا ہے
وَلَوْ يُؤَاخِذُ : اور اگر پکڑے	اللّٰهُ : اللہ
النَّاسَ : لوگوں کو	بِظُلْمِهِمْ : ان ظلم کے سبب سے
مَّا تَرَكَ : تو وہ نہ چھوڑے	عَلَيْهَا : اس (زمین) پر
مِنْ دَآبَّةٍ : کوئی بھی چلنے والا	وَّلٰكِنْ : اور لیکن
يُّؤَخِّرُهُمْ : وہ مہلت دیتا ہے ان کو	اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى : ایک معیّن مدّت تک
فَاِذَا جَآءَ : پھر جب آجائے	اَجَلُهُمْ : ان کا وقت
لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ : تو وہ لوگ پیچھے نہیں ہوں گے	سَاعَةً : ایک گھڑی (لمحہ) بھر
وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ : اور نہ ہی آگے ہوں گے	وَيَجْعَلُوْنَ : اور وہ بناتے ہیں
لِلّٰهِ : اللہ کے لیے	مَا : وہ جس کو
يَكْرَهُوْنَ : یہ لوگ (خود) ناپسند کرتے ہیں	وَتَصِفُ : اور بیان کرتی ہیں
اَلْسِنَتُهُمُ : ان کی زبانیں	الْكَذِبَ : جھوٹ
اَنَّ لَهُمُ : کہ ان کے لیے ہے	الْحُسْنٰى : بہترین
لَا جَرَمَ : کوئی شک نہیں	اَنَّ لَهُمُ : کہ ان کے لیے
النَّارَ : آگ ہے	وَاَنَّهُمْ : اور یہ کہ وہ لوگ
مُّفْرَطُوْنَ : زیادہ کیے جانے والے ہیں	

نوٹ: تفسیر ''روح البیان'' میں ہے کہ مسلمان کو چاہیے کہ لڑکی پیدا ہونے پر لڑکے سے زیادہ خوشی کا اظہار کرے تاکہ اہل جاہلیت کے فعل پر ردّ ہو جائے۔ ایک حدیث میں ہے کہ وہ عورت مبارک ہوتی ہے جس کے پہلے پیٹ سے لڑکی پیدا ہو۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۴۹ میں بیٹوں سے پہلے بیٹیوں کا ذکر کرنے سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ پہلے لڑکی کی پیدا ہونا افضل ہے۔ (معارف القرآن) ۞۞۞

> اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں' آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

جدید اخلاقی بحران کی فکری بنیادیں

ڈاکٹر رشید ارشد

تعارف

جب آدمی کسی مرض میں مبتلا ہو جائے تو معالج سب سے پہلے عیاں علامت کا معائنہ کر کے لاحق مرض کی تشخیص کرتے ہوئے اس کے اسباب کی نشان دہی کرتا ہے۔ بعد ازاں لاحق مرض سے نجات کے لیے پرہیز یا ہدایات تجویز کی صورت میں فراہم کی جاتی ہیں۔ فرد کی طرح ایک معاشرہ بھی کئی طرح کے امراض میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ معاصر جدید معاشرے کو لاحق امراض کی علامات‘ جنہیں چارلس ٹیلر نے مجموعی طور پر ’’جدیدیت کی گھبراہٹ‘‘ (malaise of modernity) کا عنوان دیا‘ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ البتہ ان کی درست تشخیص اتنی واضح نہیں ہے۔ چونکہ جدیدیت کے موجودہ مظاہر کی داستان فکری تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے‘ اس لیے جدید دور میں تشویش ناک حد تک پروان چڑھ چکے سماجی مسائل کی بروقت تشخیص کے لیے ان کی فکری بنیادوں سے آشنائی بے حد ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ افکار و نظریات خارج پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کہے میں کسی شک کی گنجائش بھی نہیں۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ انتہائی گہرے اثرات کے حامل افکار و نظریات سے بسا اوقات صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے۔ یہ فکری بنیادیں ہمارے شعور کی داغ بیل ڈالتے ہوئے ہماری روزمرّہ زندگی کے معمولات کو متعین کرتی ہیں۔ ان کی مدد سے ہم ظہور پزیر ہونے والی اشیاء کے بارے تعینات قائم کرتے ہیں اور امکاناتِ زیست کی حد بندی کرتے ہیں۔ ایک نظریہ جتنا زیادہ مؤثر ہوگا اتنا ہی اس کے ادارہ جات‘ روایات اور خیالات میں سرایت کر جانے کے قوی امکان موجود ہوں گے۔ ایسے تمام نہایت اہم افکار و نظریات کی جانچ پڑتال کرنا اور ان پر کوئی رائے پیش کرنا ایک دِقت طلب کام ہوتا ہے۔ اگرچہ افکار و نظریات کے خارج پر اثرات تو واضح ہوتے ہیں لیکن ہم عموماً اپنے سماجی اور ثقافتی حالات و واقعات کے پیچھے کارفرما اُن افکار و نظریات کی نشان دہی بہ آسانی نہیں کر پاتے۔

چند تمہیدی باتیں

معاصر جدید دنیا میں گوناگوں مسائل نظر آتے ہیں اور اسے طرح طرح کے امراض لاحق ہیں۔ ان میں سب سے مہلک مرض اخلاقی بحران ہے۔ زیرِ نظر تحریر میں بالخصوص جدید اخلاقی بحران کی فکری بنیادوں کو سامنے لانے کی کوشش کی جائے گی۔ جو اثرات‘ علامات کی صورت میں نظر آ رہے ہیں‘ ان کی نہ صرف فکری بنیادوں تک رسائی ضروری ہے بلکہ اس تاریخی سیاق و سباق کو سامنے لانا بھی اہم ہے جس میں ان افکار نے جنم لیا اور وقت کے

ساتھ ساتھ اپنی نشوونما کرتے رہے۔ اقبال اجمیری کے شعر میں خوب صورتی سے اس امر کو بیان کیا گیا ہے: ؎

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

جدید افکار نے جہاں ماضی کی روایات‘ نظریات‘ رسومات اور اقدار کو اپنے انداز سے مسخ کیا‘ وہیں ادیان بھی ان کی یلغار سے بچ نہ سکے۔ ایمانیات کے بعد دین کو سب سے بڑا چیلنج اخلاقیات کے شعبے میں درپیش ہے۔ جدید مغرب نے نفسِ انسانی کی تمام سطحوں سے خدا کی بے دخلی کا جو منظم منصوبہ بنایا تھا اس میں ذہن کو ایمان سے نامانوس کر دینا‘ اخلاق کو ارتقائی عمل کا نتیجہ قرار دے کر طبیعت کے اخلاقی جوہر کو غیر مذہبی بنا دینا اور ان دونوں کے نتیجے میں پورے انسانی نصب العین کو بدل کر رکھ دینا تھا۔ یہ اس منصوبے کے خاص الخاص مقاصد تھے۔

یہ بات بجا ہے کہ جدید افکار نے اپنے منفی اثرات سے سابقہ روایت کی اعلیٰ اقدار کی شکست و ریخت میں اہم کردار ادا کیا‘ تاہم اپنے حصے کی کوتاہی سے صرفِ نظر بھی خوش آئند نہیں۔ بقول سلیم احمد: ؎

میں وہ سفاک آنکھیں ڈھونڈتا ہوں
جو خود کو دیکھنے کی تاب لائیں

بدقسمتی سے کچھ مدّت ہوگئی ہے کہ ہمارے ہاں مختلف اسباب سے ایمان‘ شعور‘ اخلاق اور طبیعت کے تلازمات پر زیادہ توجہ نہ دی جاسکی۔ ان سب سے آدمی کے اخلاقی وجود کو بھی‘ جو اپنی ساخت میں ظاہر دین سے جڑ کر نشوونما پانے والا ہے‘ اپنے مربوط اور تخلیقی اظہار کا موقع نہ مل سکا۔ ہماری اجتماعی دانش کی کم از کم دو صدیوں سے یہ عالمگیر کوتاہی اور پس ماندگی ہے کہ اس نے دینی بیانیے کے ایک لازمی کردار یعنی ’’تغیر کی خُو رکھنے والے آدمی‘‘ کو سرے سے نظر انداز کیے رکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آدمی کا ذہن اور اس کی دنیا اگرچہ تبدیلی کے جبری اور فطری نظام کے تحت بدلتی رہی‘ لیکن تبدیلی کی اس رو کی باگ دین کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ انسانی اجتماعیت کے نئے نئے ادارے بنتے رہے اور ان میں وسعت اور پیچیدگی بھی پیدا ہوتی رہی‘ مگر مذہبی ذہن اور کردار اس سارے عمل سے لاتعلق رہا۔ اسے یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ خاص طور پر اخلاق اگر اجتماعیت کی فعال اساس نہ بنیں تو یہ محض شاعرانہ تصورات بن کر رہ جاتے ہیں‘ جن کی آدمی کو فی الواقع کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ نئے سماجی اور اجتماعی رشتوں نے اپنے جواز اور بقا کے لیے ایک ایسا اخلاقی دروبست ترتیب دیا جس کے نتیجہ خیز طور پر عمل میں آنے کے بعد یہ سوال رفتہ رفتہ زیادہ سنگینی اختیار کرتا چلا گیا کہ ’’آدمی کو اپنی اخلاقی رہنمائی کے لیے آخر مذہب کی ضرورت ہی کیا ہے؟‘‘
جدید مغرب نے اخلاق میں ایک تنظیمی مضبوطی اور قانونی پھیلاؤ پیدا کر کے یہ دکھانے کی کاوش کی کہ اخلاق کے فطری اور آفاقی اصول کسی بھی مابعد الطبیعی سیاق و سباق سے نہ صرف یہ کہ آزاد ہیں‘ بلکہ یہ آزادی ہی آفاقی اخلاقی اقدار کے قیام کا سبب اور ان کے تغیر آشنا تسلسل کی ضامن ہے۔ مذہب اپنے structural تحکم کی وجہ سے ذہن اور اخلاق کی حرکت کو روک دیتا ہے جس کے نتیجے میں نئے اصول اور ان کے تازہ اطلاقات کی پیدائش کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اوپر سے اہلِ مذہب نے مکمل طور پر غیر مؤثر ہو جانے کے بعد انسان اور دنیا پر اپنا تصرف

بحال کرنے کے لیے جو علمی اور اخلاقی کوششیں کیں وہ اتنی فرومایہ بلکہ غیر انسانی تھیں کہ انہیں دیکھ کر وہ لوگ بھی مغربی تصوّراتِ علم واخلاق سے متاثر ہونے پر مجبور ہو گئے جن کا مغربی تہذیب سے تعلق نہ تھا۔ موجودہ زمانے میں یہ صورتِ حال غالباً اپنی قبیح ترین شکل میں سامنے آچکی ہے۔ اب کسی راسخ العقیدہ مخلص مسلمان کے لیے بھی یہ کہنا ممکن نہیں رہا کہ اہلِ اسلام اپنے ہی مسلّمہ اخلاقی معیارات پر مغرب کی برابری کر سکتے ہیں۔ یہ اس بحران کا انتہائی درجہ ہے کہ دین سے سنجیدہ اور مخلصانہ وابستگی رکھنے والے خداترس لوگ ایک ذہنی اور اخلاقی کم تری کے احساس میں مبتلا ہو چکے ہیں، اور اس سے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں پاتے۔

ایک طرف دہشت گرد قوتیں دین کے عالمگیر غلبے کے آئیڈیل کی آڑ لے کر سرگرمِ عمل ہیں تو دوسری طرف عالَمِ اسلام کی عمومی بے حسی اپنے عروج پر ہے۔ ان دونوں نے مل کر اسلام کا ایسا تشخص بنا دیا ہے جسے قبول کرنا، ذہنی طور پر پس ماندگی ہے اور اخلاقی طور پر سفاکی۔ ایسی ناموافق فضا میں جو عالمگیر ہے، یہ لازمی طور پر ایک بڑا چیلنج دکھائی دیتا ہے کہ اللہ کو ماننے یا مسلمان ہونے کا علمی اور اخلاقی جواز کیا ہے! مغربِ جدید کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان اپنی تمام علمی واخلاقی ضرورتیں خدا اور مذہب کے بغیر زیادہ کامیابی اور آزادی کے ساتھ پوری کر سکتا ہے۔ اس دعوے کو قیاسی منطق اور idealistic استدلال سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی تردید کے لیے جوابی عملی ماڈلز درکار ہیں جن سے عالَمِ اسلام خالی ہے۔ ہم دین اور اخلاق کے لازمی تعلق پر نظری بحث تو یقیناً کر سکتے ہیں لیکن اس کا کوئی حاصل وصول نہ ہوگا، کیونکہ ہمارا عمل ہمارے نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا، اور یہی ہمارے خلاف سب سے بڑا گواہ ہے۔ اختلاف اس بات پر نہیں ہے کہ دین اخلاق کا ماخذ بن سکتا ہے یا نہیں، اصل جھگڑا اس چیز پر ہے کہ اخلاق کے لیے دین ناگزیر ہے بھی یا نہیں! اس پہلو سے ہم خود احتسابی کے جذبے کے ساتھ گفتگو کریں گے جس میں خود کو کوئی رعایت دیے بغیر یہ دیکھنے اور بتانے کی سعی کی جائے گی کہ انسان کا اخلاقی وجود اس کے ایمانی وجود سے منقطع ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا، اور یہ صرف مذہبی دعویٰ نہیں بلکہ ایسی مسلّمہ حقیقت ہے جسے استدلال کی ہر قسم سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ مغرب کے اس دعوے کی کیا حقیقت ہے کہ اس نے مذہب سے آزاد ہو کر اخلاقی آدرش حاصل کر دکھایا ہے۔ مغرب کیا واقعی دُنیا کے لیے ایک اخلاقی نمونہ ہے؟ کیا اخلاق کے فطری آئیڈیلز مغرب نے حاصل کر لیے ہیں؟ ہمارا جواب ہے کہ نہیں! مغرب نے یقیناً ایک محکم ترین اجتماعی آرڈر بننے میں کامیابی حاصل کی ہے لیکن اس آرڈر کی اساس اخلاق نہیں بلکہ طاقت ہے۔ طاقت کے ڈھانچے کمزور پڑ جائیں تو مغرب وہ تہذیبی اور اخلاقی سکت نہیں رکھتا کہ اپنے اس نظام کو برقرار رکھ سکے، جس میں مثال کے طور پر لوگ سچ بولتے ہیں، خوراک میں ملاوٹ نہیں کی جاتی، قانون پسندی کا دور دورہ ہے۔ مغربی تہذیب ایک آرگنائزیشن یا کارپوریشن کی طرح ہے جس کے ہر کارکن کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی گئی ہے کہ اگر تم نے طے شدہ ضابطوں اور مقاصد کی پابندی نہ کی تو اس میں تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ زندگی میں جتنی رنگینی اس

آرگنائزیشن کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے وہ سراب بن جائے گی۔ اس طرح کی افادیتی تنظیم‘ مفاداتی قانون پسندی اور تاجرانہ دیانت داری سے‘ مبنی بر اخلاق تہذیب نہیں پیدا ہوتی۔ تہذیب کچھ اور شے ہے جبکہ اجتماعی اداروں کی working chain کچھ اور۔ بالکل غیر مذہبی زاویے سے بھی اگر مغربِ جدید کا تہذیبی اور نفسیاتی تجزیہ کیا جا سکے تو یہ بات زیادہ دیر تک پوشیدہ نہیں رہے گی کہ مغرب کی نام نہاد اخلاقی برتری کے تمام مظاہر فطری اور اخلاقی نہیں بلکہ مشینی اور افادی ہیں۔ اخلاق کے موضوع کو مذہبی فکر نے سادہ تو رکھا لیکن اسے محدود بھی کر دیا۔ اسی طرح مغرب نے اخلاق میں ذہنی اور نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا کر کے اسے واقعے سے زیادہ تہذیبی اور ارتقائی بنا دیا۔ آج ہمیں اپنے تصوّرِ اخلاق کے ایسے فہم اور بیان کی ضرورت ہے جس میں انسان کے اخلاقی وجود ہونے کی مستقل بنیادیں اور دائمی غایات بھی آ جائیں اور اس کے ساتھ ان تفصیلات کا بھی قدرے احاطہ ہو جائے‘ جو زمانے کی تبدیلی سے اور وقت کے تقاضوں کے تحت انسان کی اخلاقی تشکیل کے مسلسل عمل میں ایک مؤثر کردار رکھتی ہیں۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ فطری سے ہماری اور مغرب کی مراد کیا ہے! مغرب اگر اخلاق کو فطری مانے گا تو اس کے یہاں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اخلاق طبعی‘ نفسیاتی اور ارتقائی ہوتے ہیں‘ جبکہ ہمارے یہاں فطری کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے۔ انسان مخلوق ہے اور اس کی تخلیق کا مادہ اور مقصود اپنے خالق کی بندگی ہے۔ اس اصلِ بندگی کی قبولیت اور پوری کی پوری استعداد انسان کو دے کر پیدا کیا گیا ہے۔ اس قبولیت اور استعداد کو فطرت کہتے ہیں اور فطری سے مراد وہ امر ہوتا ہے جو ہماری وجودی ساخت اور بندگی کے تقاضے کے مطابق ہو۔ جب ہم اخلاق کو فطری کہتے ہیں تو ہماری مراد اس کے سوا نہیں ہوتی کہ یہ بندگی کے فضائل ہیں جنہیں انسانیت کے بنیادی مادے کی حیثیت حاصل ہے۔

تصوّرِ اخلاق کا براہِ راست تعلق اس سوال سے ہے کہ: انسان کیا ہے؟ انسان ایک سماجی وجود ہے‘ انسان ایک عقلی وجود ہے یا محض طبعی وجود ہے جس میں شعور اور اجتماعیت وغیرہ اتفاقی طور پر در آئے ہیں؟ ہمارا موقف یہ ہے کہ انسان بندگی کی اصل پر قائم ایک سماجی وجود ہے‘ یعنی انسان انفرادیت اور اجتماعیت دونوں سطحوں پر ان شرطوں سے خالی نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اس حیثیت میں ایک اس کی تنہائی ہے‘ اور ایک معاشرت۔ اخلاق ان تینوں زاویوں سے انسانی شخصیت کی تشکیل کے اسباب اور نتائج ہیں۔ اسباب کی حیثیت سے یہ فطری‘ تہذیبی اور قانونی ہیں جبکہ نتائج کے اعتبار سے یہ وہ فضائل ہیں جو دنیا کو بھی اچھا بناتے ہیں اور آخرت میں بھی فلاح کا ضامن بنتے ہیں۔ اس تصورِ انسان کی روشنی میں یہ تو ممکن ہے کہ بعض مظاہرِ اخلاق کسی تہذیبی پیش رفت سے پیدا ہو جائیں‘ لیکن یہ محال ہے کہ اخلاق کا پورا نظام یعنی تعلق باللہ‘ اپنے نفس کے ساتھ تعلق اور دوسرے لوگوں یا چیزوں کے ساتھ تعلق کسی تہذیب کے نتیجے میں پیدا ہو۔ انسان کے معاشرتی اخلاق بھی بندگی کی اصل پر تشکیل پاتے ہیں۔ تعلق باللہ سے تربیت پانے والا اخلاقی وجود ہی سماجی ہونے کے ہر طرح کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ وہ تقاضے مذہبی بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مذہبی بھی‘ یعنی تہذیبی وعرفی وغیرہ بھی۔ مسلم تصوّرِ اخلاق میں انسانوں کے باہمی تعلق کو

خیر کے ماحول میں پروان چڑھانے والی تمام قوتیں وہی ہوتی ہیں جو تعلق مع الحق سے حاصل ہوتی ہیں اور اسی حوالے سے اخلاقی اصالت' سند اور اہمیت اخذ کرتی ہیں۔ تعلق باللہ کے آداب سے بے بہرہ ہو کر انسانی تعلقات کا نظام اخلاقی پیمانے پر نہیں چلایا جا سکتا' چاہے اس نظام میں کتنی ہی خوش حالی' سلامتی اور کامیابی نظر آئے۔ یہ ایک آفاقی مسلّمہ ہے کہ اخلاق' دوسرے کو خوش رکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ مسلم تناظر میں یہ ''دوسرا'' بلحاظِ اصل اللہ ہے اور عارضی طور پر تعلق کے دائرے میں آنے والی سب چیزیں۔ مغربی تصورِ اخلاق سے ہمارا اصل اختلاف یہی ہے کہ اخلاق کی اساس بننے والا ''دوسرا'' کون ہے۔ ان کے یہاں یہ ''دوسرا'' اوّل تو مستقل اور متعین نہیں ہے اور اگر اہلِ مغرب کو بتانا ہی پڑے تو وہ کبھی انسان کا نام لیں گے' کبھی ریاست کا اور کبھی معاشرے کا' جبکہ ہمارے یہاں اس سوال کا ایک ہی جواب ہے۔

جدید تصوّرات پر استوار دنیائے جدید کا تار و پود

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مغرب اپنی تہذیبی برتری کو دنیا سے منوانا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ کوئی بھی حربہ استعمال کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کے علمی و اخلاقی زوال کے تقریباً تمام مظاہر مغرب ہی کی سوچی سمجھی تخلیقات ہیں جن کو مسلمان اپنے دینی شعور اور مزاج میں بگاڑ آ جانے کی وجہ سے پہلے تو سمجھ نہ سکے اور جب مغرب کا یہ تخریبی کردار سمجھ میں آ گیا تو اس کے ازالے کی کوئی مؤثر قوت مسلمانوں کے پاس نہیں تھی۔ چونکہ ہم اخلاقیات کے مخصوص پہلو سے جدید افکار کے مضر اثرات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں' اس لیے آئندہ صفحات میں ہم دنیائے جدید کی نقشہ گری کرنے والے ان جدید تصورات کا جائزہ پیش کریں گے جنہوں نے اخلاقیات کے شعبے میں دراندازی کرتے ہوئے اخلاقی بحران کو اس نہج تک پہنچا دیا ہے۔

سیکولرازم

سیکولرازم کے نقاد اس کے فکر اور اخلاقی انحطاط میں پائے جانے والے ربط کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں ایک امریکی مضمون نگار رچرڈ ویور نے لکھا' کہ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ جدید آدمی اخلاقی سطح پر خبط کا شکار ہے۔ وِیور کے نزدیک اس کا سبب ماورائی وجود کی حقانیت اور بذاتِ خود سچ اور صداقت کا انکار ہے۔ جدید فکر میں انسان کو ہر معیار بہ شمول اخلاقی معیار طے کرنے کے اختیارات کی دستیابی کے ساتھ ہمہ گیر اخلاقی اقدار کا خاتمہ ہونا شروع ہوا جس کے نتیجے میں معاشرت میں موضوعیت' نرگسیت اور انانیت جیسے مہلک انسانی رویوں نے جنم لیا۔ فرد کو آزاد' خود مختار متصور کر کے انانیت پسندی کے فلسفے نے جدید اخلاقیات میں اپنے لیے جگہ بنائی۔ اخلاقیات میں انانیت پسندی ایک ایسا فلسفہ ہے جو انفرادی مفادات کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دیتے ہوئے فرد کو خود غرضانہ انداز میں محض اپنی بھلائی' افادے اور مسرت کے کاموں کو سرانجام دینے کی تلقین کرتا ہے۔ اس نظریے کے تحت فرد کے لیے اولین اخلاقی فریضہ ذاتی خواہشات کی تکمیل ہے۔ اخلاقیات کا یہ نظریہ اجتماعی معاشرے کی اقدار (مثال کے طور پر فلاحِ عامہ' عدل و انصاف اور مجموعی معاشرت) کی بہتری کی راہ میں حائل

ایک بہت بڑی رکاوٹ کے طور پر سامنے آتا ہے۔ فرد کی مرکزیت پر پُرزور تاکید کی وجہ سے یہ اخلاقی فلسفہ تمام روایتی نظریات سے کٹ جاتا ہے۔ اس نظریے نے فرد کی فطرت کی خودغرضانہ جہت کو تقویت پہنچائی اور اخلاقیات کے تمام شائستہ اصولوں کو تہس نہس کرتے ہوئے معاشرے میں بگاڑ پیدا کیا۔

اپنی کتاب After Virtue میں میک انٹائر نے یہ مقدمہ پیش کیا ہے کہ یورپ اخلاقی سطح پر تباہ و برباد ہو کر نظری اور عملی دونوں حوالوں سے اخلاقیات سے محروم ہو چکا ہے۔ مغربی ثقافت میں اخلاقیات کے ساتھ ہونے والے کھلواڑ کے نتیجے میں اب وہاں کوئی مربوط اخلاقی نظام وضع نہیں کیا جا سکتا۔ جدید اور مابعد جدید پیرائے میں دیکھا جائے تو مغربی معاشرہ ایک ایسے دور سے گزر رہا ہے جہاں ہمہ گیر صداقت' اخلاقی اصول اور تقدیس نامی کسی شے کا وجود تک باقی نہیں ہے۔ ہمہ گیریت اور ماورائیت کے انکار کے ساتھ افراد کے رویوں میں پیدا ہونے والے غیر انسانی اوصاف نے سرزمین مغرب کو بحیثیت مجموعی اخلاق باختہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ خدا کے انکار سے پیدا ہونے والے خلا کو انسان دوستی یا انسان مرکزیت کے فلسفہ سے پُر کیا گیا۔ دیکھا جائے تو خدا سے انکاری سماج کے لیے انسان دوستی ہی واحد متبادل نہیں ہے بلکہ ایک راہ Nihilism کی جانب بھی جاتی ہے۔ وجودی Nihilism کی رُو سے انسانی زندگی معنویت سے خالی ہے' جبکہ اخلاقی Nihilism کی رُو سے ہمہ گیر اخلاقی ضابطے کا کہیں وجود نہیں۔ یہ محض انسانی معاشروں کی اختراع ہے تاکہ وہ اس بے معنی دنیا میں گزر اوقات کو ممکن بنا سکیں۔ Nihilism اس بات کو سامنے لاتی ہے کہ زندگی سے متعلقہ وجودی نوعیت کے سوالات کا کبھی تشفی بخش جواب فراہم ہی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ازلی اور ابدی سچائی کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ اس فکر کے ماننے والوں کے نزدیک انسان دوستی کا فلسفہ بھی مذہبی اقدار سے اخذ کردہ التباس کے سوا کچھ نہیں۔ اگر دیکھا جائے تو معاصر تہذیبِ مغرب کی درست نمائندگی سیکولر انسان دوستی کی بجائے Nihilism کر رہی ہے جو کسی بھی اخلاقی ضابطے کو کسی بھی صورت تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ تاریخ فلسفہ کے مطالعے سے یہ باور ہوگا کہ Nihilism سائنس پرستی' متشدد اضافیت پسندی اور ہمہ گیر سچائیوں کے مابعد جدید انکار کا ایک منطقی نتیجہ ہے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں امریکہ میں پھیلی سیریل کلنگ میں ملوث مجرمان کے بیانات سن کر اندارہ ہوتا ہے کہ کیسے اخلاقی اضافیت پسندی اور Nihilism ایک دوسرے میں مدغم ہو چکے ہیں۔

جدید تصوّرِ عقل

جدیدیت کا پہلا نمائندہ فرانسیسی فلسفی رینے ڈیکارٹ کو سمجھا جاتا ہے' جس نے قبل از جدید خدا مرکزیت کی حامل بادشاہت اور کلیسا کے اختیارات کو علمیات کی بنیاد پر انسان مرکزیت کی حامل موضوعیت سے بدل دیا۔ مافوق الفطرت الوہی ذات کا تصور خارج از بحث ہو گیا اور اختیارات کی مرکزیت خودمختار انسانی عقل کے ہاں منتقل ہو گئی۔ اگرچہ رینے ڈیکارٹ خدا پر ایمان رکھتا تھا' تاہم یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس کی فکر نے تشکیک پسندی' لاادریت اور الحاد کے بیج بوئے۔ ڈیکارٹ کی علمیات سے عقلیت کو روایتی' مذہبی اور الہامی کلام کے اوپر غلبہ حاصل ہوا۔ ذہن

اور جسم کی دوئی سے مذہب کو مادی دنیا کے معاملات سے بے دخل کر دیا گیا۔ تاہم' اگر عہدِ وسطیٰ کی فکری تاریخ کا بھی جائزہ لیں تو علمیات میں بتدریج تبدیلی نے اُس دور سے اخلاقیات کو اپنے طور پر متاثر کیا ہے۔ تھامس اوقیناس نے دو مابعد الطبیعی حلقوں طبیعی فطرت (nature) اور grace کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق طبیعی فطرت کو ہم اپنے حواسِ خمسہ کی معلومات اور معقولات کو تصرف میں لا کر جان سکتے ہیں۔ البتہ اس طبیعی فطرت سے ماوراء ایک حقیقت ہے جسے صرف وحی کی روشنی میں جانا جاسکتا ہے۔ یعنی grace کے زمرے میں الوہی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے جب کہ طبیعی فطرت پر فطری قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ اوقیناس کی قائم کردہ اس دوئی نے بعد کی مغربی فکر میں ایک نیا تصوّر متعارف کروایا۔ الوہی قوانین کے ماتحت grace کو وحی سے جب کہ فطری قوانین کے ماتحت طبیعی فطرت کو حسیات اور عقل سے جانا جاسکتا ہے۔ روزمرہ زندگی کے اخلاقی اعمال میں اوقیناس نے انسانی عقل کے عمل دخل کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ وحی کی رہنمائی کی حاجت روزمرہ معمول سے ہٹ کر روحانی سرگرمیوں کی انجام دہی میں پڑتی ہے۔

تحریک روشن خیالی کی فکر میں خودمختار انسانی عقل کا درجہ مذہبی احکامات اور وحی سے بلند قرار پایا۔ انسانی عقل کو معیار بناتے ہوئے ایمانیات اور معجزات وغیرہ کو غیر عقلی قرار دے کر ان کا انکار کر دیا گیا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں وحی کی رہنمائی کے بغیر عقل کو مہمل کہا گیا' جبکہ جدید دور میں عقل کی رہنمائی کے بغیر وحی کو مہمل قرار دیا گیا۔ جدید تصورِ عقل آلاتی عقل یعنی instrumental reason کا داعی ہے۔ مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے بطور آلہ مستعمل عقل کو فلسفیانہ اصطلاح میں آلاتی عقل کہا جاتا ہے۔ جہاں یہ تصورِ عقل جدید سائنسی انقلاب اور فنیات کی ترقی کے لیے مدو معاون ثابت ہوا وہیں اس نے تاریخِ انسانیت کے کئی المناک حادثات کو بھی جنم دیا ہے۔ جدیدیت کا یہ مقدمہ رہا ہے کہ ماضی کی توہم پرستانہ روایات سے آزادی' متروکہ خیالات سے قطع تعلقی اور بربریت سے نجات جدید تصورِ عقل یعنی instrumental reason کی رہنمائی میں ممکن ہو پائی۔ جدید دنیا کے معاشیاتی' سیاسیاتی اور انتظامی ڈھانچوں میں آلاتی عقل کے تصرف کے منفی رُخ کو مابعد جدید مفکّر اور فلسفی فوکو اور ہیبر ماس نے اپنی تحاریر میں مفصّل انداز سے بیان کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی انسانی رویوں اور اخلاقیات پر اس طرزِ ذہنیت کے مہلک اثرات پڑے ہیں۔ آلاتی عقل کی پیروی میں انسان جذبات اور احساسات سے عاری ہوتے ہوئے اپنے گردونواح اور فطرت سے قائم زندہ تعلق سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

روایت میں عقل ایک جز وتھی لیکن جدید تصورِ عقل کے مطابق یہ جسم' جذبات' احساسات' سماج اور تاریخی سیاق وسباق سے کٹ کر اپنے آپ میں ایک خودمختار اور آزاد کُل بن چکی ہے۔ سرد اور بے مہر خواص کی حامل یہ آلاتی عقل کسی لطیف انسانی قدر کو خاطر میں نہیں لاتی' لیکن ساتھ ہی بہترین نتائج کی وجہ سے معاشیاتی اور سیاسیاتی انتظام وانصرام کے اداروں اور عوام الناس کی قبولیت بھی حاصل کر لیتی ہے۔ سیکولر انسان مرکزیت نظریے کے مطابق انسانی صلاحیتوں میں عقل کی مرکزی حیثیت ہونے کی وجہ سے اخلاقی فیصلوں میں اسے بنیادی مقام ومرتبہ

حاصل ہے۔ تاہم‘ روایتی اور اسلامی نظریات کے مطابق عقل کو مرکزیت حاصل نہیں ہے۔ عقل وجودِ باری تعالیٰ کی رہنمائی کی روشنی کے بغیر ناقص ہے۔ دوسری طرف سیکولر طرزِفکر پر مبنی اخلاقیات میں عقل پرستی کے تحت کیے جانے والے فیصلوں کی زیادہ قدر ومنزلت ہے۔ امانوئیل کانٹ‘ جیرمی بینتھم اور جان اسٹویرٹ مِل نے ایسے اخلاقی اصول وضع کیے جن سے کوئی معقول آدمی انکار نہ کر سکے۔ تاہم‘ ان تمام نے اپنی اخلاقیات میں جو نتائج اخذ کیے وہ ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ بغور جائزہ لینے پر معلوم ہوگا کہ اخلاقیات کو عقلی معیارات کے تابع کرنے کی تمام کوششوں میں بالآخر غیر عقلی مفروضوں کو بنیاد بنانا پڑتا ہے۔ اب بہت سے سیکولر مفکّرین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ محض عقل کو اخلاقیات میں self-justified بنیاد ماننا کافی دشوار ہے۔ مثال کے طور پر ڈیوڈ ہیوم کے نزدیک تمام عقلی سرگرمیاں انسانی جذبات کے تابع ہوتی ہیں‘ جبکہ عقلیت پسندوں نے انسانی جذبات کے پہلو کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔ تاہم مذہب اور جدید نفسیات میں یہ مانا جاتا ہے کہ انسانی فطرت کا ایک پہلو ایسا ہے جو کسی صورت بھی تعقلات کے تابع نہیں رہ سکتا۔ انسانی تعلقات اور مراسم میں احترام اور محبت کے رویوں کو عقل کی بجائے انسانی شائستہ جذبات کے تحت ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روشن خیالی کی بہت سی اخلاقی اقدار مسیحیت کی اقدار ہی سے اخذ شدہ ہیں۔ باوجود اس حقیقت کے جدید سیکولر لبرل معاشروں میں ان مذہبی اور روایتی اقدار کو تضحیک آمیزی کا نشانہ بناتے ہوئے انسانی معاشرے کو ان سے علیحدہ کرنے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا رہا ہے۔ میک انٹائر کے مطابق اخلاقیات کو تعقلات پر قائم لبرل اقدار کے تابع کرنے کا مشن بری طرح ناکام ہو کر ثقافتی اضافیت پسندی پر منتج ہوا۔

جب کسی مافوق الفطرت واحد ہستی کو انسانی معاملات سے بے دخل کر کے انسان کے خودساختہ اصول و ضوابط کو رہنما تسلیم کر لیا گیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ متفرق خطوں کے‘ مختلف تاریخی سیاق وسباق اور جدا جدا مکانی و زمانی وابستگیوں کے حامل لوگوں کے مختلف نظریات کی بنیاد پر بنائے جانے والے اصول وضوابط میں فرق کی وجہ سے کیا کوئی ہمہ گیر اصول بنایا جا سکتا ہے! اضافیت پسندوں کا ماننا ہے کہ سچائی نہ تو ہمہ گیر ہے اور نہ ہی مستقل‘ بلکہ جغرافیائی‘ تاریخی اور ثقافتی حوالوں سے بدلتی رہتی ہے۔ اخلاقیات میں اضافیت پسندی کی ترویج پر بہت سے اخلاقی فلاسفہ نے شدید مخالفت کی لیکن اس کے باوجود اس میں کشش کا ایک ایسا پہلو موجود ہے جس پر کوئی دو رائے نہیں پائی جاتیں۔ وہ پہلو ہے: مختلف ثقافتی اور نظریاتی پس منظر کے لوگوں کے ساتھ احسن سلوک سے پیش آنے کی ترغیب۔ بالخصوص استعماری غلبے کے بعد سے اس فکر کو تقویت پہنچی ہے کہ دنیا میں کسی مخصوص کلچر کو کسی دوسرے کلچر پر برتری قائم کرنے کا کوئی اصولی یا اخلاقی جواز موجود نہیں۔ اضافیت پسندی کے مقدمہ کو بشری علوم کی روشنی میں دیکھا جائے تو انواع واقسام کے خطوں میں رائج رسوم ورواج کی اہمیت کا اقرار بھی اس کے حق میں جاتا ہے۔ البتہ دوسری طرف دیکھا جائے تو ان ہی خطوں میں رسوم ورواج کے نام پر ایسے ایسے لغو قوانین بنائے گئے ہیں جو کہ صریحاً غیر انسانی اور انسانیت کی تذلیل کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس نکتے پر اضافیت پسندی کے مقدمے

میں جھول پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر اضافیت پسندی کو درست مانا جائے تو پھر دنیا بھر کی تمام مضحکہ خیز اور غیر انسانی رسومات کو بھی درست ماننا پڑے گا۔ اضافیت پسندی کی وجہ سے اجتماعی سطح پر تو معاشرے میں موضوعیت در آئی ہی ہے' ساتھ ساتھ فرد کی انفرادی زندگی میں اسی کے راستے موضوعیت اور نرگسیت بھی در آئی ہے جو انانیت پسندی کی طرف لے جاتی ہے۔

سائنسز سے برآمد تصوّرِ انسان

سیکولر فکر میں موجود ''ترقی'' اور ''اخلاقی ترقی'' کے تصوّرات تضادات سے بھرے ہوئے ہیں۔ جدید حیاتیاتی سائنس میں انسان کو محض حیوان تصور کیا جاتا ہے جو کہ اپنی جبلی خواہشات کے تابع ہے اور ساتھ ہی انسان کے عقل کی رہنمائی میں تہذیب یافتہ ہونے کا تصور بھی پایا جاتا ہے۔ ان تمام تناقضات اور تضادات کے باوجود ''ترقی کے تصور'' کی عام مقبولیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترقی سے وابستہ ''ایمان'' غیر عقلی ہے۔ نظریۂ ارتقا کے پیش کردہ تصورِ انسان اور اس پر استوار تصور ہائے حیات کو دیکھا جائے تو انسان اپنی حیوانی جبلتوں کے ہاتھوں بے بس اپنی بقا کی خاطر مقابلے کی دوڑ میں شامل اپنے جینیاتی نظام کے تحت مجبور اور بے بس جانور سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس نظریے کی رُو سے انسانی فطرت نامی کوئی شے نہیں۔ انسانی زندگی کی تمام اخلاقی اقدار اور خواص وقت کے ساتھ ساتھ سامنے آنے والا موافقت اور مطابقت کا لائحہ عمل ہے جو نیچرل سلیکشن سے ممکن ہوا۔ جینیاتی نظام کے تحت انسانی اوصاف کے متعین اور طے شدہ ہونے کے تصور سے ایک خاص قسم کی جبریت پیدا ہوتی ہے۔ ان نظریات سے مسئلۂ ارادہ واختیار میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ جب سب کچھ جینیاتی ساخت میں متعین ہے تو پھر انسانی اخلاقی نشوونما اور وعظ ونصیحت کی تمام سرگرمیاں بھی مہمل اور بے معنی ٹھہرتی ہیں' کیونکہ جینیاتی معلومات کو بدلنا ناممکن ہے۔

فرانسس کرک اور بی ایف اسکینر جیسے مفکّرین نے فرد کی آزادی کو بالکل ہی رد کر دیا اور خارجی طبیعی ماحول کے جبر کی حمایت میں فکر پیش کی۔ بی ایف اسکینر بنیادی طور پر ایک نفسیات دان تھے۔ انہوں نے نفسیات کو جدید سائنسی طریقہ کار کے مطابق ڈھالا اور اپنی تحاریر میں معاملات انسانی سے بحث کرتے ہوئے سائنس اور سائنسی کے الفاظ کا بے دریغ استعمال کیے رکھا۔ ان کے نزدیک thing in itself کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ تمام حقیقت طبیعی اور مادی ہے جسے کرک کے مطابق طبیعیات اور کیمیا کی اصطلاحات میں بیان کیا جاسکتا ہے جبکہ اسکینر کے مطابق انسان کا خارجی ماحول انسانی صورت حال اور ثقافت وغیرہ کا تعین کرتا ہے۔ ان دونوں کے تصوّرِ اخلاقیات میں انسانی بقا کا مقدمہ گُندھا ہوا ہے۔

اسکینر کے مکتب فکر یعنی Behaviourism میں انسان کو ایک ایسی مجبور شے کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو اپنے خارجی ماحول کے اتار چڑھاؤ کے ہاتھوں بے بس ہے۔ مزید یہ کہ انسانی رویے کو کسی خارجی تکنیکی قوت سے مَن مرضی کے ساتھ بدل کر کسی بھی رنگ میں رنگا جاسکتا ہے۔ اسکینر کا طبیعی پرستانہ تصورِ اخلاق بھی اس کی اس فکری

اپروچ سے جڑا ہوا ہے۔ سیکولر فکر سائنسی علوم کو ترجیح دیتی ہے۔ سائنسی علوم کے تحت انسانی خصائص اور عادات و خصائل وراثتی طور پر متعین شدہ ہوتے ہیں، جب کہ دوسری طرف یہی سیکولر فکر انسانی آزادی کا بھرپور پرچار بھی کرتی ہے۔ اس سے سیکولرازم میں پائے جانے والی خود تضادی واضح ہوتی ہے۔ اگر جبر کے پہلو کو دیکھا جائے تو عقلیت پسندی کے علوم بھی غیر عقلی قوتوں کے زیر تسلّط ہیں۔ جدید سائنسی طریقے سے متاثر جدید نفسیات کو جب جرائم پیشہ افراد کی ذہنیت سمجھنے کے لیے استعمال کیا گیا تو انسان سے سرزد ہونے والے عوامل کو خارجی ماحول اور اس کی دسترس سے باہر موجود غیر شعوری قوتوں کی کارفرمائی قرار دیا جانے لگا۔ مزید برآں جرم اور گناہ، بدی کو نفسیاتی معنوں میں دیکھا جانے لگا۔ جرائم پیشہ افراد کو سزا دینے کی بجائے ان کو مناسب علاج معالجہ فراہم کرنے کے لیے کارل راجر نے آواز اٹھائی۔ جرائم مرتکب کرنے والوں کو اس وجہ سے سہولت مل گئی۔ جب جرائم کے ارتکاب کو فرد کے شعوری فعل کی بجائے غیر شعوری قوتوں اور اس کے کنٹرول سے باہر عناصر کا عمل دخل قرار دیا جانے لگا تو مجرموں کی حوصلہ افزائی ہونے لگی۔ محققین کا کہنا ہے اس سے جرائم میں مزید اضافہ ہوا۔ اسی طرح جدید نفسیات میں ایسی اصطلاحات کو متعارف کروایا گیا جو معاشرے کے لیے مہلک رویوں کے اوپر غلاف چڑھانے کا کام سرانجام دیتی ہیں۔ ان تمام عوامل کا نتیجہ معاشرتی، سماجی اور اخلاقی بگاڑ کی صورت میں نکلا۔

نظریۂ ارتقا

سیکولر فکر کے متفرق حامی مکاتبِ فکر کو اگر ایک مشترک نظریہ متحد کرتا ہے تو وہ ہے ڈارون کا نظریۂ ارتقا۔ یہ نظریہ ایک طرف مذہبی عقائد (بالخصوص نظریۂ تخلیق) کا رد کرتا ہے تو دوسری طرف انسانی ترقی اور بہتر مستقبل کے لیے جِدّ وجُہد کے تصوّر سے مطابقت بھی رکھتا ہے۔ ڈارون کے حیاتیاتی ارتقا کے افکار نے بعدازاں ہربرٹ اسپنسر کے سماجی ارتقا کو جنم دیا۔ اسپنسر نے جب ان افکار کا سماج پر اطلاق کیا تو بقا کی خاطر جنگ کے لیے ایک نسل کے دوسری نسل پر غلبے اور تسلط کو بھی جواز فراہم ہو گیا۔ اگرچہ ڈارون کو موردِ الزام ٹھہرانا مشکل ہوگا، تاہم اسی کے افکار نے دوسری نسلوں پر برطانوی اور امریکیوں کے ظلم وستم کرنے کی راہیں ہموار کیں اور بعدازاں ہٹلر کی صورت میں نسلی برتری کے زعم میں دوسری نسل کے افراد کا قتل عام کرنے کو معقول قرار دینے میں معاونت کی۔ اسی طرح نوڈارون ارتقائی افکار انسان کے بےلوث اور لاغرض اعمال وافعال کو انائیت اور خود غرضی کی پیداوار سمجھتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانیت کے لیے پیش کی جانے والی انسانی قربانیاں بھی بےمحل ٹھہرتی ہیں۔ اس فکر کے تحت جو تصوّرِ اخلاق اخذ ہوتا ہے وہ غصہ، لالچ، حسد اور ان جیسے متعدد اخلاقی رذائل کو انسانی فطرت کے معمولی خاصے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اب اگر انسانی اعمال اس کے جینز کی ساخت نے متعین کرنے ہیں تو پھر نیک اخلاق اور بداخلاق کے حامل کردار کا بیان ہی بےمحل ٹھہرے گا، نہ ہی اخلاقیات کا کوئی معیار یا پیمانہ مقرر ہو سکے گا۔ ان تصوّرات سے عمومی رجحان یہ پیدا ہوتا ہے کہ جیسے اخلاقیات کا سارا نظام سوائے التباس کے کچھ بھی نہیں، جس کا نتیجہ لازماً اخلاقی انحطاط ہی نکلتا ہے۔ نظریۂ ارتقا سے قائم کیے جانے والے تصورِ کائنات کو قبول کرنے میں اس کے حامی مفکّرین بھی جھجک

محسوس کرتے ہیں کیونکہ اس میں ذات‘ اخلاقیات اور معنویت جیسی مباحث بالکل ہی بے معنی ثابت ہوتی ہیں۔ نظریۂ ارتقا نے انسانی قدر و منزلت کو بہت حد تک گرایا اور اسے محض حیوان کے رتبے پر لا کھڑا کیا۔ ؎

عوض قرآں کے ہے اب ڈارون کا ذکر یاروں میں
جہاں تھے حضرتِ آدم وہاں بندر اچھلتے ہیں (اکبر)

سائنسی‘ مادیت پرستانہ اور بالخصوص نظریہ ارتقا کے بعد انسانی مقام و منزلت کی تذلیل کی صورت میں ردِّعمل کے طور پر وجودیت پسندی کی تحریک اٹھی۔ الحادی وجودیت پسندی کے سرخیل ژاں پال سارتر نے اخلاقی معاملات میں فرد کی خودمختاری‘ آزادی کی تحریکی روپ میں حمایت کی۔ انسان کا جوہر‘ اس کا شعور آزاد ہے اور اس کا آزادانہ استعمال ہی اسے مستند وجود بناتا ہے۔ جب تک وہ اپنی آزادی کا استعمال کر کے فیصلوں کا انتخاب نہیں کرتا‘ وہ غیر مستند وجود کے زمرے میں شامل کیا جائے گا۔ آزادی کے اس تصرف میں اسے کسی وجودِ خدا کی حاجت نہیں جو فیصلوں اور انتخابات کے لیے اخلاقی قوانین وضوابط لاگو کرے۔ ان اخلاقی نظریات سے جنم لیتی انفرادیت پسندی کے راستے معاشرے میں بڑھتی بے راہ روی کے ضمن میں وجودیت پسندی کو ہدفِ تنقید بنایا گیا لیکن سارتر نے بارہا ان اعتراضات کا رد کیا اور فرد کی آزادی کی پُرزور حمایت جاری رکھی۔ سارتر کے نزدیک فرد اپنے آزاد ارادہ کے ساتھ فیصلہ کر کے جو عمل سرانجام دے گا‘ اس کے نتائج کی ذمہ داری اسی کے کندھوں پر عائد ہوگی۔ وجودیت پسند اخلاقیات کانٹ کی اخلاقیات کے خودمختاریت کے مسلّمہ سے اتفاق کے ساتھ اس کی فکر میں موجود طبیعی جبریت کی قائل نہیں۔

(جاری ہے) ۞۞

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

مبادیٔ علم کلام

سعید عبداللطیف فودہ

ترجمہ: مکرم محمود

لگ بھگ تین سال قبل اس کتاب ’’بحوث فی علم الکلام‘‘ کا ترجمہ مکمل کیا تھا۔ اُس وقت ’’مصنوعی ذہانت‘‘ (artificial intelligence) کی یلغار نہ تھی کہ ترجمہ کا کام کارِعبث محسوس ہوتا۔ اب تو کچھ یوں ہی محسوس ہوتا ہے۔ بہرحال اس کتاب کے مصنف عصرِ حاضر کے مشہور متکلم سعید عبداللطیف فودہ ہیں‘ جن کا تعلق اردن سے ہے۔ آپ علم الکلام اور اصول الفقہ سے متعلق بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں۔ علم الکلام اور اصول الفقہ کو اصلین بھی کہا جاتا ہے۔ کتاب میں جہاں سے ذیل میں ترجمہ دیا جارہا ہے‘اس سے پہلے ایک ابتدائیہ اور ایک موضوع بعنوان ’’مکلف انسان پر سب سے پہلے کیا واجب ہے؟‘‘ پر بات ہے۔ اس کا ترجمہ ’’حکمتِ قرآن‘‘ کے شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۲۲ میں ایک مضمون ’’علم العقیدہ‘ سعید عبداللطیف فودہ اور عصرِ حاضر‘‘ کے ضمن میں پہلے چھپ چکا ہے۔ اس سے آگے کچھ حصہ کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ بریکٹ میں بعض جگہوں پر تشریحی و توضیحی اضافے راقم الحروف کے ہیں۔ اس حصہ میں بہت سے اہم مباحث مذکور ہیں مثلاً علم کلام کی تعریفات‘ علم اور اعتقاد میں فرق‘ اعتقادیات اور عملیات میں فرق‘ مقلد کے ایمان کا مسئلہ وغیرہ۔

علمِ توحید کے مبادی سے متعلق مقدّمہ

علم توحید کے طالب کے لیے ضروری ہے کہ وہ آغاز میں اس علم کا ایک اجمالی تصور حاصل کرے چاہے رسم ہی کیوں نہ ہو (یعنی حد نہ ہو۔ منطق میں ’رسم‘ ناقص تعریف کو کہتے ہیں جبکہ ’حد‘ کامل تعریف کو کہا جاتا ہے) تاکہ اس کی طلب کی بنیاد کسی بصیرت پر ہو۔ وہ اس علم کے موضوع کو دوسرے موضوعات سے جدا کرسکے اور اس علم کی غایت سے بھی واقف ہوجائے تاکہ اس علم کے ساتھ اس کی مشغولیت بے فائدہ اور بے مقصد نہ رہ جائے۔ پھر وہ یہ بھی جان لے کہ یہ علم کن کن علوم اور مبادی سے مدد حاصل کرتا ہے؟ اس کا فائدہ کیا ہے؟ اس علم کو وضع کرنے والا کون ہے؟

علمِ کلام کی تعریف

بعض شیوخِ کلام کے نزدیک اس علم کی تعریف ہے: وہ علم جس کے ذریعے دلائل بیان کرکے اور شبہات کو

دور کر کے دوسرے پر دینی عقائد کو ثابت کرنے کی نہ صرف قدرت حاصل ہو جاتی ہے بلکہ دوسرے پر ان کو لازم کر دیا جاتا ہے (کہ اس کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی سوائے خواہشات‘ مفاد اور ہٹ دھرمی کے)۔

امام عضد الدین الایجی ’’مواقف‘‘ میں فرماتے ہیں: ’’علم کلام وہ علم ہے جس کی بنیاد پر دلائل وارد کر کے شبہات کو ردّ اور دینی عقائد کو ثابت کرنے پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔‘‘ عقائد سے یہاں (ماننے جانے والے قضایا یا) ماننے کا فعل ہی مراد ہے‘ عمل اس کی مراد میں شامل نہیں اور دین سے مراد دین محمد ﷺ ہے (شرح المواقف للشریف الجرجانی ۱/۳۴)۔ امام سعد الدین تفتازانی فرماتے ہیں: ’’علم کلام یقینی دلائل کے ساتھ دینی عقائد کے علم کو کہتے ہیں۔‘‘ (تہذیب الکلام: ص ۸ ‘للامام سعد الدین تفتازانی)۔ امام ابن ہمام ’’مسایرہ‘‘ میں فرماتے ہیں: ’’علم کلام نفس کی ایسی معرفت ہے جس کے ذریعے اسلامی عقائد جو اس پر لازم ہیں‘ ان کا علم حاصل ہو جائے۔ یہ علم قطعی دلائل سے حاصل ہوتا ہے لیکن بعض دلائل ظنی بھی ہوتے ہیں۔‘‘ (ص ۱۰) (ظنی دلائل عقائد میں صرف فروعات کے لیے دلیل بن سکتے ہیں‘ بنیادی اور اصولی معتقدات کے لیے نہیں۔)

مندرجہ بالا تعریفات سے یہ بات آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے کہ یہ علم عقیدہ کو دل میں راسخ کرنے‘ دلیل سے مخاطب کو خاموش کر دینے اور اس پر حُجّت تمام کر دینے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ جب انسان صحیح عقیدہ کا فہم حاصل کر لیتا ہے اور یہ عقیدہ اس کے جی میں ثبات پکڑ لیتا ہے تو گویا اس نے دنیا و آخرت کی مطلوب سعادت کو حاصل کر لیا۔ اس کو ایسا تصور حاصل ہو گیا ہے جو حقیقت کے عین مطابق ہے اور اُس کے نفس کو ایک ایسی کیفیت حاصل ہو گئی ہے کہ کُل وجود سے ایک گونہ ہم آہنگی اور وجودی موافقت کو اُس نے حاصل کر لیا۔ ایسا انسان ظاہر ہے کہ سعادت‘ جو کہ کمالِ وجود ہے‘ اس کو حاصل کر لے گا۔ اس سعادت کو ہم ممکن الوجود کے لیے درجاتِ وجود میں ترقی سے بھی عبارت کر سکتے ہیں (چونکہ ممکن الوجود نقص سے خالی نہیں ہو سکتا اس لیے کمالِ وجود کو بھی مکمل طور پر حاصل نہیں کر سکتا۔)

اسلامی عقیدہ کے بغیر انسان اس سعادت کو نہیں پا سکتا۔ عقیدۂ اسلام کو اختیار کرنے کے بعد ہی کائنات اور زندگی سے انسان کا تعلق مکمل ہو جاتا ہے۔ وہ ان کی طبیعت‘ اہداف اور غایات کا صحیح ادراک کر لیتا ہے۔ اس کی زندگی سے تضادات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وہ ہم آہنگی کو حاصل کر لیتا ہے۔ دوسرے انسانوں سے تعلق کی حس بھی اس میں بیدار ہو جاتی ہے اور پھر جو ان کے ساتھ معاملہ کرتا ہے وہ حق اور عدل کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھنا سیکھ لیتا ہے۔ سعادت اور نیکی کی حقیقت بھی اصل میں یہی ہے۔

جو علم اتنی اعلیٰ غایات کے حصول کا ذریعہ ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ گھٹیا اور ہلکا علم ہے‘ کسی صورت بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ جو انسان یہ بات کر رہا ہے وہ دراصل جانتا ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جو علم اتنے بڑے مقاصد کو پانے کا ذریعہ ہو‘ اسے تو علوم میں بہت اعلیٰ مرتبہ کا حامل ہونا چاہیے۔ اہلِ حق کے بڑے بڑے علماء کے نزدیک یہ علم اسی مرتبہ کا حامل ہے۔ جو انسان تمہیں یہ کہہ کر اس علم سے متنفّر کرنے کی کوشش کرے کہ یہ بدعت ہے‘

اس کے دھوکے میں مت آنا۔ کیا خیر کو اختیار کرنا بدعت ہے؟ کیا اپنے نفس میں کفر سے لڑنے کے لیے‘ دوسرے سے کفر کی آلائش کو دور کرنے کے لیے اور دین حق اور خیر کو کفر کے برے اثرات سے بچانے کے لیے اسلحہ کی تیاری (یعنی اس علم کو حاصل کرنا) بدعت ہے؟ ہر وہ انسان جس کو اس علم کی تھوڑی سی بھی پہچان حاصل ہے‘ یہ بات جانتا ہے کہ انکشافِ حقیقت‘ نفس کے اطمینان اور اہلِ بدعت وکفر اور اہلِ تشکیک کے الزامات کے جواب دینے میں یہ علم کتنی مدد فراہم کرتا ہے۔ اس علم کے حصول سے انسان پر تعصب‘ تقلید کے بغیر اور دلیل و برہان کی بنیاد پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام ہی دین حق ہے۔

اسی لیے اس علم میں صرف قطعی اور یقینی دلائل ہی لیے جاتے ہیں (اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظنی دلائل اور ظنی مسائل زیر بحث نہیں آتے)۔ مختلف احکام اور مفاہیم کے اثبات یا نفی میں یقین ہی اساس قرار پاتا ہے۔ عقائد کے معاملات میں ظنی دلائل معتبر نہیں سمجھے جاتے‘ اگرچہ عملی معاملات میں ان سے کام لیا جاتا ہے۔ بنیادی عقائدی مسائل میں جو غور وفکر قطعی بات تک نہ پہنچائے‘ اس سے دلیل ہی اخذ نہیں کی جاتی۔ ظنی معاملات میں خطا کا امکان ہوتا ہے لہٰذا عقیدہ کی بنیاد کسی ایسے معاملے پر رکھنا جس میں غلطی کا امکان ہو‘ درست نہیں۔ جو بھی عقیدہ کی بنیاد ظنی بات یا دلیل پر رکھتا ہے وہ اصلاً عقیدہ کے مفہوم ہی سے واقف نہیں۔

اعتقادی مسائل اصل میں کچھ کلی مفاہیم ہیں جن پر انسانی زندگی کی اساس ہے۔ جو شخص زندگی کی بنیاد ایسے امور پر رکھتا ہے جو خود ثابت شدہ نہ ہوں وہ زندگی کو زیادہ سنجیدہ نہیں لے رہا۔ کوئی بھی عاقل انسان زندگی کو کھیل کود اور بے کار نہیں سمجھتا۔

جہاں تک عملی معاملات کا تعلق ہے‘ وہ تو انفرادی اور جزوی ہوتے ہیں۔ ایک عاقل کے نزدیک کُل حیات کی بنیاد جزئی اور شخصی معاملات پر رکھنا درست طرزِ عمل نہیں ہے۔ اسی لیے جزوی معاملات میں ظن کی پیروی کو بھی صحیح قرار دیا گیا ہے‘ کیونکہ ظن اصل میں تو حقیقت اور واقع کے مطابق ہوتا ہے البتہ اس کے ساتھ غلطی کا احتمال بھی رہتا ہے۔ اس کو صحیح قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جزئی معاملات میں قطعیت اور یقین کا حصول اکثر ممکن نہیں ہوتا۔ اگر ہم ہر معاملہ میں یقین کو لازم قرار دے دیں گے تو زندگی کے بہت سے ضروری کام ناممکن ہوکر رہ جائیں گے۔ ان وجوہات سے عملی معاملات میں ظن غالب ہی کو کافی سمجھا گیا ہے۔

اسی لیے خبر واحد یقین اور قطعیت کا باعث نہیں ہوتی اگر اور قرائن سے صرفِ نظر کر کے صرف اس کو دیکھا جائے کیونکہ انسان (نبی کے علاوہ) معصوم مطلق نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے خبر واحد کو قبولِ مطلق حاصل نہیں ہے۔ مطلق کا لفظ ہم اس لیے استعمال کر رہے ہیں کیونکہ یہ بعید ہے کہ کوئی خبر واحد ہر جگہ پر قابلِ قبول ہو۔ ایسا تب ہی ہوسکتا ہے جب وہ ہر جگہ پر صادق ہو‘ لیکن بحث ونظر کے بعد یہ جان لیا گیا ہے کہ خبر واحد عام طور پر ایسی نہیں ہوتی۔ اسی لیے ہر جگہ وہ قابلِ قبول نہیں ہوتی بلکہ کچھ جگہوں پر اسے قبول کیا جاتا ہے اور بعض مواقع پر ردّ۔ اس کا تعین اس خبر کے ساتھ واقع ہونے والے قرائن واحوال کو جانچنے کے بعد کیا جاتا ہے۔ (ایک صورت میں اسے مطلقاً قبول کیا

جاتا ہے) اگر تمام جہات سے اس کی قطعیت کسی دوسری دلیل کی بنا پر ثابت ہو جائے۔

خبر واحد تمام قرائن سے مجرد حالت میں ظن ہی پیدا کرتی ہے' اور یہ بھی راوی کے ثقہ ہونے پر ہے۔ اگر راوی ثقہ نہ ہو تو پھر ظن بھی حاصل نہ ہو سکے گا بلکہ وہ خبر جھوٹی اور مردود ہو گی یا مشکوک قرار دی جائے گی۔ اس لیے عقائد کی بنیاد خبر واحد پر نہیں رکھی جاسکتی اور نہ اخبار آحاد سے عقائد کو اخذ کیا جا سکتا ہے۔ عقائد قطعی دلائل سے ہی اخذ کیے جاتے ہیں۔ ان (قطعی دلائل) میں خبر متواتر ہے' کیونکہ تواتر یقین پیدا کرتا ہے۔ اب تک کی بات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عملیات میں تو خبر واحد سے دلیل اخذ کی جاسکتی ہے لیکن عقائد میں نہیں' مگر یہ ہے کہ اگر دوسرے قرائن اور قطعی دلائل سے خبر واحد میں بیان ہونے والی بات ثابت ہوتی ہو (تو تب عقیدہ میں بھی اس سے استدلال کیا جا سکتا ہے) جیسا کہ ہمارے علمائے اصول نے اس کو عمدہ طریقے سے واضح کیا ہے۔

اس تعریف سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شرعیات کے دائرہ سے باہر علوم عقائد سے کوئی سروکار نہیں رکھتے اور نہ وہ عقائد کے معاملات میں معتبر ہیں' مثلاً طبیعیات اور ریاضیات وغیرہ۔ اس طرح شریعت کا وہ دائرہ جس کا تعلق عملیات وفرعیات سے ہے اس کا تعلق بھی اصلاً عقائد سے نہیں بلکہ اس کو فقہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگر فروعی اور عملی معاملات بھی عقائد میں معتبر ہو جائیں تو ان معاملات میں مخالف کی تکفیر لازم آئے گی۔ تکفیر تک معاملہ نہ بھی پہنچے تو اس کو بدعتی قرار دینا' اس سے نفرت اور راضی نہ ہونا تو ہوگا ہی۔ یہیں سے عدم موافقت' اختلاف اور قطع تعلقی جنم لے گی۔ اگر فرعیات کو عقائد کی سطح پر لے آیا جائے تو اپنے سے مخالفت کرنے والے مسلمان سے نفرت لازماً پیدا ہو گی' عقیدہ میں نہیں بلکہ فقہی مسائل میں اور اس کا نتیجہ تفرقہ وفساد کی صورت میں نکلے گا۔

اسی بات سے ان لوگوں کی غلطی بھی واضح ہوتی ہے جو عقائد اور عملیات سے متعلقہ احکام کے (قرآن وسنت سے) اخذ کرنے کے طریقے میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور ان کو بھی قطعی سمجھتے ہیں' (یعنی) فقہی معاملات کو بھی قطعی قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک (ان کے اس نظریہ کی وجہ سے) صرف فقہی معاملات میں اختلاف کی بنیاد پر بھی دوستی اور براءت لازمی آتی ہے۔ اس بات کو وہ اگر فقہ میں پائے جانے والے قطعی معاملات تک محدود رکھتے تو شاید معاملہ بہتر ہوتا۔ لیکن یہ تعمیم (یعنی اس بات کو ہر فقہی مسئلہ تک عام کر دینا) انوکھی ہے۔ یہ لوگ اہلِ سُنّت والجماعت میں نہیں ہیں اور نہ ہی جس منہج پر یہ لوگ اعتماد کیے بیٹھے ہیں اس کا اہل حق کے طریقے سے کوئی تعلق ہے۔ ان کے اس قول سے درست منہج ومسلک سے ان کی دوری کی حدود نمایاں ہوتی ہیں۔ وہ لوگ اپنے اس طرح کے اقوال سے مسلمانوں میں فتنوں اور مشکلات کو جنم دے رہے ہیں جس کے نتیجہ میں منافقین اور کفار کے بالمقابل' ان میں تفرقہ اور شکستگی پیدا ہو گی۔ اسی لیے ہم ہمیشہ یہ دیکھتے آ رہے ہیں کہ کافر اور ظالم ریاستیں اس طرح کے لوگوں اور ان کے افکار کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ ان کو عوام الناس میں انتشار پھیلانے اور ان کے عقائد ونفسیات کو مسخ کرنے اور فکری ہیجان پیدا کرنے کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ ان مجرموں کو یہ چیز خوش آتی ہے کیونکہ ان کے لیے عوام الناس پر غلبہ اور ان کے ہدف کے حصول کو آسان بناتی ہے۔ (اسی طرح) دین کا استحصال اپنے خاص

مقاصد کے حصول کے لیے بھی آسان ہو جاتا ہے۔ یہ چیز دشمنانِ دین کو ایسے مختلف قسم کے اسلحے فراہم کر دیتی ہے کہ ان کے لیے حق اور ہدایت کے داعیوں (کی کوششوں) کو پامال کرنا اور ان کی بری صورت عام لوگوں کے دل میں قائم کرنا ممکن ہو جاتا ہے' کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے پاس عوام الناس کو متاثر کرنے کے وسائل موجود ہیں۔ یہیں سے ان لوگوں کے ہاتھ ان کو نقصان پہنچانے بلکہ مطلقاً ختم کر دینے کا جواز آ جاتا ہے۔

مقلّد کا اعتقاد علم ہے یا نہیں؟

سوال یہ ہے کہ مقلّد محض اپنے سینے میں جو (اعتقادات) پاتا ہے اس پر علم کا اطلاق درست ہے یا نہیں؟ اگر علم کے مفہوم میں دلیل کو شامل سمجھا جائے تو (مقلد کے اعتقادات) قطعی طور پر علم قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اگر ایسا نہیں ہے (یعنی علم میں دلیل کو شامل نہ سمجھا جائے) تو پھر وہ علم ہے۔ بعض علماء نے دوسرے نقطہ نظر کو اختیار کیا ہے۔ غور و فکر کرنے والا شاید دوسری رائے کی طرف ہی مائل ہو' کیونکہ درست مفاہیم تک پہنچنا' اور یقین' اطاعت اور تسلیم کے ساتھ اس سے جڑے رہنا ہی دلیل اور نظر سے مقصود ہے۔ اگر مقلد کو یہ مفاہیم حاصل ہو جاتے ہیں تو اس کو فکرِ سلیم کا مالک کہا جا سکتا ہے۔ اس کو یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ ان (مفاہیم) کا عالم ہے لیکن وہ ان کی دلیل سے ناواقف ہوتا ہے۔ ان دونوں اقوال میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ ایک انسان کے لیے ان دونوں کو ایک ساتھ قبول کرنا ممکن ہے (دونوں اقوال سے مراد یہ ہے کہ علم کی ماہیت میں دلیل شامل ہے یا نہیں)۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ علم تو یقین اور قطعیت کے ساتھ اور خارج کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوئے ادراکِ حقائق کا نام ہے (یعنی محض علم کے لیے اتنا کافی ہے' دلیل ایک اضافی کمال ہے) اور علم کا کمال علم کے دلیل کے ساتھ متصف ہونے میں ہے۔ اس لیے صحیح العقیدہ مقلد کے دخولِ اسلام کی درستگی اور آخرت میں نجات کے لیے اللہ کی مشیت سے اتنا علم (بغیر دلیل کے) کافی ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم قبولِ ایمان اور مطلق علم کے مفہوم میں فرق کرتے ہیں۔ قبولِ ایمان قطعیت اور یقین پر مبنی ہے چاہے (ایمان لانے والے کو) دلیل حاصل نہ ہو۔ جہاں تک علم کا معاملہ ہے تو اس میں قطعیت دلیل کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ مقلد کا ایمان تو قبول ہو جائے گا لیکن دلیل کے ساتھ علم جو مقلد پر واجب ہے وہ اس کے ذمہ باقی رہے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بغیر دلیل کے مقلد کا رتبہ اس انسان سے بہت کم ہے جو دلیل بھی جانتا ہے۔ پھر جس نے دلیل کو بذاتِ خود جانا ہے اس کا رتبہ اس سے بہت بلند ہے جس نے دلیل کو دوسرے سے سیکھا ہے۔ یہ (علم کے) درجات ہیں جیسے وجود میں درجات ہوتے ہیں۔ یہ تو مطلق ایمان سے متعلق بات تھی۔

جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ علم بغیر موجب (ایسی بات یا چیز جو علم کو لازمی یا واجب کرے' دلیل اس میں شامل ہے) کے نہیں ہوتا۔ موجب کبھی حواس ہوتے ہیں' کبھی نظر عقلی اور کبھی موجب میں نقلی مقدمات پر اعتماد شامل ہوتا ہے' یا اس کے علاوہ کچھ ہوتا ہے جیسا کہ علم اصول و منطق میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی

ہے کہ صرف مجرد تصور کو جو خارج سے مطابقت رکھتا ہو‘ علم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ضروری ہے کہ وہ کسی دلیل سے ثابت ہو‘ تا کہ اس کو علم کہا جا سکے۔ یعنی دلیل علم کی ماہیت میں شامل ہے۔ علم کے تین لازمی خصائص ہیں :

(۱) یقین وقطعیت

(۲) خارج سے مطابقت

(۳) اس کے لیے موجب (دلیل) کا ہونا

یقین وقطعیت اور مطابقت تو ایسے لوازم ہیں کہ علم سے ان کو منہا کرنے کا تصور ہی ممکن نہیں۔ جہاں تک موجب اور دلیل کا معاملہ ہے تو اس میں بعض کا اختلاف ہے۔ جن لوگوں نے دلیل کو علم کی ماہیت میں شامل کیا ہے اور اعتقاد (ایمان) کو دلیل کے ساتھ مشروط ٹھہرایا ہے ان کے نزدیک جو دلیل نہیں رکھتا (یعنی مقلد) اس کا اعتقاد باطل ہے۔ البتہ اگر اس نے اعتقاد کو علم کے ساتھ مشروط نہیں قرار دیا بلکہ صرف یقینی اور قطعی تصور اور اس کی (خارج سے) مطابقت کو ہی ضروری ٹھہرایا ہے تو اس کے نزدیک مقلد کا اعتقاد صحیح ہے (یعنی مقبول ہے)۔ جو علم کی ماہیت میں دلیل کو شامل نہیں سمجھتا لیکن اعتقاد کو علم کے ساتھ مشروط قرار دیتا ہے‘ اس کے نزدیک تو ہر صورت میں مقلد کا ایمان قابلِ قبول ہے۔ اس (آخری بیان کردہ) مذہب میں علم اور اعتقاد کی دوئی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

بنیادی بات یہ ہے کہ اہلِ سُنّت کے جمہور نے مقلد کے ایمان کو صحیح قرار دیا ہے لیکن اس پر دلیل کو واجب بھی ٹھہرایا ہے۔ اگر وہ دلیل سے واقف نہیں ہوتا تو اس کو گناہ گار شمار کیا جائے گا۔

جہاں تک علم کلام کا معاملہ ہے تو یہ جان لینا چاہیے کہ کوئی بھی انسان بغیر دلائل کے علم کے علم توحید‘ جو کہ خدا کی ذات وصفات کا علم ہے‘ کا عالم نہیں بن سکتا۔ اس علم کے مقاصد میں مخالف کو دلائل سے ساکت کرنا‘ عقائد کو دلوں میں جازم وراسخ کرنا اور ان کی شرح ووضاحت کرنا شامل ہیں جو بغیر دلائل کے علم کے ممکن نہیں۔ اس بات میں اور مقلد کے ایمان کی بحث میں خلط سے بچنا چاہیے۔ مقلد کے ایمان کے سلسلے میں جو بات ابھی کی گئی ہے اس میں مختلف فیہ مسئلہ یہ تھا کہ مقلد کا ایمان مقبول ہے یا نہیں! مقلد جس کا ادراک کرتا ہے اس کو علم کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ (جبکہ اب بات متکلم کی ہو رہی ہے نہ کہ مقلد کی) تمام اقوال سے یہ نتیجہ تو نکلتا ہی ہے کہ مقلد اس فن (علم کلام) کا آدمی نہیں ہے اور مقلد کی حیثیت سے اس پر اس علم کا کھولنا مناسب نہیں ہے‘ لیکن اگر وہ طالب علم بن کر اس علم کو حاصل کرنا چاہتا ہے تب کوئی حرج نہیں۔ اس فن کو اگر زیادہ مقلدین کے سامنے پیش کیا جائے تو اس کے نتیجہ میں لازماً فتنہ اور مشکلات جنم لیتی ہیں۔ اس لیے اکثر اہلِ علم یہ کہتے ہیں علم فقہ کے برخلاف علم کلام جو کہ علم توحید ہے‘ خواص کا علم ہے۔ اسے عوام پر پیش کرنا مناسب نہیں۔ ویسے تحقیقی بات تو یہ ہے کہ علم فقہ میں بھی ہر مسئلہ کا نشر عام جائز نہیں۔ جو علم فقہ اور اس کے مسائل پر گہری نگاہ رکھتا ہے‘ اس پر یہ بات مخفی نہیں۔

اس لیے سب پر تمام علوم میں اور خاص طور پر علومِ شرعیہ کی تعلیم میں لوگوں کے احوال کی رعایت لازمی ہے۔ کسی کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ اس بات سے اجنبیت محسوس کرے اور منکر ہو جائے اور یہ سوال اٹھائے

کہ ایک معاملہ جو کہ دینی معاملات میں سے ہے اس کے بارے میں یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ اس کی تعلیم سب کو نہ دی جائے ! الزامی طور خاموش کرنے کے لیے اس کو یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ: ’’تمہاری مراد یہ ہے کہ دینی معارف اور غیب کے معاملات میں اللہ کے نبی ﷺ جو کچھ جانتے تھے وہ سب لوگ جانتے ہیں یا ان کو جاننا چاہیے؟ اگر تم ہاں کہتے ہو تو تم اس قولِ رسولؐ کی مخالفت کر رہے ہو جس میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ’’اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم روؤ زیادہ اور ہنسو کم‘‘ تم نے حضرت علی ؓ کے اس قول کی بھی صریح مخالفت کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ: ’’لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق گفتگو کیا کرو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو جھٹلا دیا جائے؟‘‘ پس بہت سے دینی حقائق و معارف سے لوگوں کی ایک قلیل تعداد ہی واقف ہوتی ہے اور انہی کو اہل علم کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ درجات میں دوسروں سے بلند ہوتے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم کو دوسروں پر فضیلت دی ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے عوام الناس کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اہلِ علم سے پوچھیں۔ جاہل سے امورِ دینی کی بابت استفسار اور اس کے اس طرح کے معاملات میں الجھنے کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کو اہلِ علم کی اطاعت کے ساتھ جوڑ کر بیان کیا ہے۔ اس معاملہ کو اس طرح نہ سمجھا جائے کہ ان معاملات کو چھپایا جا رہا ہے جن کو سب کے سامنے ظاہر کرنا ضروری ہے بلکہ یہ ان امور کا اخفا ہے جن کی معرفت کا حق عام لوگوں کو حاصل نہیں‘ یا اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ علماء پر ان کا بیان اور تعریف واجب نہیں۔ عاقلوں پر یہ بات مخفی نہیں کہ بہت سے امور کی تبیین و وضاحت تمام لوگوں کے سامنے کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ معاملہ لوگوں سے معاملات کو چھپانے یا پوشیدہ رکھنے کا نہیں بلکہ یہ امور و معاملات کو ان کے درجہ اور ان کی مناسب جگہ پر رکھنے کا ہے۔ اس بات میں عقلاء کو غور و فکر کرنا چاہیے۔

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 450 روپے، اشاعت عام 300 روپے

مباحثِ عقیدہ (۲۲)

مؤمن محمود

اِلٰہیات‘ نبوات‘ سمعیات

الٰہیات کے باب میں پہلا عنوان الحمدللہ ہم نے مکمل کر لیا۔ عقیدے کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا: الٰہیات‘ نبوات اور سمعیات۔ اِلٰہیات کے باب میں ہم تین چیزوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ پہلی یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حق میں واجب صفات کون سی ہیں۔ دوسری‘ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے مستحیل صفات یا نقائص کون سے ہیں۔ تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں جائز کیا ہے۔ جو کچھ بھی مطالعہ کیا جاتا ہے یا ہم اللہ تعالیٰ کے حق میں کچھ چیزوں کو واجب قرار دیتے ہیں وہ اَلل ٹپ نہیں ہوتیں بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنا تعارف خالق‘ مالک‘ ربّ اور معبود کے طور پہ کروایا ہے تو وہ کیا صفات ہیں کہ جن کے بغیر ربّ ربّ نہیں ہوسکتا‘ خالق خالق نہیں ہوسکتا‘ معبود معبود نہیں ہوسکتا۔ وہ کون سی صفات ہیں کہ اگر خالق اور معبود میں پائی جائیں گی تو وہ خالق اور معبود نہیں رہے گا۔ وہ صفات اللہ تعالیٰ کے حق میں مستحیل کہلاتی ہیں۔ لہٰذا یہ تین عنوانات ہیں: مستحیلات‘ واجبات اور جائزات فی حق اللہ سبحانہ وتعالیٰ۔ اس ضمن میں ہم نے جو بات مکمل کر لی ہے وہ ایک اہم موضوع تھا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کن صفات کا اعتقاد رکھنا ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے اور وہ کیا صفات ہیں کہ جن کو اگر ہم نہیں مانیں گے تو گویا ربوبیت‘ اُلوہیت اور خدا کی ذات وصفات کو اس طریقے پر نہیں مان رہے جس طریقے پر رسولوں نے دعوت دی ہے۔ یہ عنوان اللہ کے فضل سے ہم مکمل کر چکے ہیں اور اس میں ہم نے وہ صفات دیکھ لیں۔ ایک صفتِ ذاتیہ ہے‘ پانچ صفاتِ سلبیہ ہیں اور سات یا آٹھ صفاتِ معنٰی ہیں۔ چنانچہ یہ موضوع مکمل ہوا۔

اعجاز القرآن

یہ بات کچھ زوردار طریقے سے بیان کی گئی تھی کہ قرآن مجید کا لفظ (text) فی نفسہٖ مقصود ہے۔ قرآن کا لفظ اور معنی دونوں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہیں اور ہمیں قرآن مجید کے لفظ سے خصوصی تعلق قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ قرآن حکیم کی کرامات اور اس کے حیرت آفریں پہلوؤں پر جو نمایاں کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ایک بڑا نام قاضی ابوبکر الباقلانیؒ کی تصنیف ’’اعجاز القرآن‘‘ کا ہے۔ قاضی ابوبکر شاگرد تھے ابوحسن الباہلیؒ کے جن کے استاذ تھے ابوالحسن الاشعریؒ۔ اس میں بھی مجھے اس بات کی تائید میں ایک لطیف نکتہ ملا۔ وہ فرماتے ہیں کہ پرانی کتابیں بھی اللہ کا کلام ہیں اور قرآن بھی اللہ کا کلام ہے لیکن پرانی کتابوں کے ذریعے تحدّی یعنی چیلنج نہیں دیا

گیا۔ پرانی کتابوں کو معجزہ قرار نہیں دیا گیا‘ ان کو معجز نہیں کہا گیا کہ جس طریقے پر قرآن مجید کو معجزہ کہا گیا۔ تو آخر بنیادی فرق کیا ہے؟ یعنی کلام اللہ تو وہ بھی ہے اور یہ بھی ہے لیکن یہ معجز ہے وہ معجز نہیں؟ فرق یہ ہے کہ اس میں جو صفتِ نفسی ہے وہ تو پہلی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے اور وہ تو معجز ہی معجز ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو معنی بیان کیے ہیں وہ معنی بشر نہیں لاسکتا‘ چاہے وہ تورات میں تھے چاہے انجیل میں‘ چاہے قرآن میں یا کسی بھی صحفِ قدیمہ میں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئے۔ اس کلام سے مقابلہ کوئی بشر نہیں کرسکتا ان معنی کے اعتبار سے کہ جن معنی پر وہ الفاظ دلیل ہوتے ہیں۔ البتہ ان کا نظم‘ ان کا لفظ معجز نہیں تھا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اگر ہم صرف معنی پر زیادہ فوکس کریں گے تو پرانی کتابوں اور قرآن میں کوئی امتیاز نہیں‘ اس اعتبار سے کہ پرانی کتاب کے بھی معنی اسی طرح معجز ہیں جس طریقے پر اس کتاب کے معنی معجز ہیں۔ فرماتے ہیں اس میں اضافی شے جس کی بنیاد پر اسے معجزہ کہا گیا اور جس کی بنیاد پر قریش مکہ کو چیلنج کیا گیا وہ اس کا لفظ ہے‘ اس کا نظم ہے‘ اس کا معنی نہیں ہے‘ اگرچہ معنی فی نفسہٖ معجز تو ہے‘ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ ہدایت بھی اللہ کے کلام اور وحی کے سوا کہیں حاصل نہیں ہوگی لیکن قرآن کا اصل معجزہ اس کا لفظ ہے۔

یہاں بھی ایک اہم بات واضح ہوتی ہے کہ لفظ سے تعلق جوڑنے کی ضرورت کیا ہے کہ جس قرآن کو چیلنج کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ اس کے معنی نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ فی نفسہٖ معجزہ ہے لیکن چیلنج لفظ کا تھا کہ اس لفظ جیسا لفظ لا کے دکھا دو۔ پھر اس پر انہوں نے ایک اور بہت ہی خوبصورت بات کی جسے قرآن پڑھنے والے کو محسوس کرنا چاہیے کہ فرق کیا ہے۔ آپ اگر پرانی کتابیں سنتے تھے تو آپ اللہ کا کلام سن رہے تھے اور آپ قرآن سنتے ہیں تب بھی اللہ کا کلام سن رہے ہیں لیکن دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ اُس کا لفظ معجز نہیں ہے‘ اس کا لفظ اور نظم دونوں معجز ہیں۔ جب آپ قرآن سنیں گے تو گویا آپ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے سن رہے ہیں جبکہ پرانی کتابوں میں یہ وصف نہیں تھا۔ جب آپ ان کی تلاوت کر رہے ہیں یا ان کو سن رہے ہیں تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے سن رہے ہیں‘ کیونکہ اس کا لفظ اس اعتبار سے معجز نہیں ہے۔ فرماتے ہیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا کلام براہِ راست سنا‘ وہ ان کی خصوصیت ہے لہٰذا ہم یہ تو نہیں کہتے کہ وہی خصوصیت بدرجہ اتم ہر شخص کو حاصل ہوجائے گی لیکن ایک نوع کی خصوصیت یا ادنیٰ مشابہت ہر اس شخص کو حاصل ہوجاتی ہے کہ جو اللہ کا کلام سنتا ہے تو گویا وہ اللہ سے سن رہا ہے‘ کیونکہ اس کا لفظ اسی طریقے پر معجز ہے جس طریقے پر معنی معجز ہے۔

پھر قاضی ابوبکر الباقلانی علیہ الرحمہ اس کا مزید نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ جو صحیح طریقے پر قرآن سنے گا اور اس کا دل ہوائے نفس سے پاک ہوگا تو اسے فوراً بدیہی طور پر یقین حاصل ہوجاتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ وہاں اسے استدلال کی ضرورت نہیں پڑتی کہ یہ اللہ کا کلام ہے یا نہیں۔ وہ کہتے ہیں اللہ کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو براہِ راست سنتے ہی بغیر غور وفکر کے فوری یقین حاصل ہوجاتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے‘ اور اصلاً قرآن کی خصوصیت یہی ہے۔ یعنی اگر انسانی دل پاک صاف ہوگا تو صرف اس کے لفظ کے اندر یہ اعجاز ہے (معنی کی بات نہیں

ہو رہی) کہ اس کو سننے والا ضروری علم حاصل کر لے گا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ چنانچہ واقعی محسوس ہوتا ہے کہ اس بات میں صداقت ہے اور قرآن مجید کے اندر یہ خصوصیت ہے۔ یہ بات قاضی ابوبکر علیہ الرحمہ نے شروع ہی میں بیان کی ہے۔ اس سے اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے جو ہم نے بیان کی تھی کہ لفظ کی اہمیت کیا ہے' لفظ سے جڑنے کی اہمیت کیا ہے اور لفظ کو صحیح پڑھنے اور سننے کی اہمیت کیا ہے!

زبان اور علوم لغت کا زوال

ہمارے ہاں بحیثیت مجموعی انسانوں کی زبان اور علومِ لغت زوال پزیر ہیں۔ یعنی اکثر لوگوں کو کوئی زبان صحیح طریقے پر نہیں آتی۔ بہت سے لوگ ہیں کہ جو اپنی مادری زبان نہ جاننے پر بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک ایسی ہی قوم پیدا ہوگئی ہے۔ لغت جاننا' لغت کی گہرائی میں اُترنا تو بالکل مفقود ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قرآن کے لفظ سے جڑنے کے لیے کم سے کم شرط اس کو صحیح پڑھنا ہے' اس کو صحیح پڑھنے سے آپ اس کے لفظ کے ساتھ جڑ جائیں گے لیکن مزید گہرائی میں جا کر دیکھنے کے لیے علم لغت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اب آپ کے سامنے قاضی ابوبکر الباقلانی علیہ الرحمہ کی شہادت بھی آگئی کہ لفظ کی کیا اہمیت ہے۔ ہمارے ہاں اس وقت لفظ کو تھوڑا سا degrade ہی کیا جا رہا ہے۔ سب کچھ معنی ہی کی دنیا ہے' افکار کی دنیا ہے۔ باقی قرآن سے سچا تعلق عموماً نصیب نہیں ہو رہا ہوتا' الا ماشاء اللہ!

مستحیلات فی حق اللہ

الٰہیات کا دوسرا باب ہے "مستحیلات فی حق اللہ" کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حق میں کیا چیزیں ہیں جن کا نہ ماننا واجب ہے۔ یعنی ہم مانیں کہ یہ چیز اللہ کے حق میں پائی نہیں جاسکتی کیونکہ اگر یہ صفت وہاں پائی گئی تو خدا خدا نہیں رہے گا' معبود معبود نہیں رہے گا۔ اس کو ہم کہتے ہیں مستحیلات فی حق اللہ سبحانہ وتعالیٰ۔ جو صفات ہم دیکھ چکے ہیں' ان سب کی ضد اللہ کے حق میں مستحیل ہے۔ چنانچہ ایک نوع کے اعتبار سے ہم سارا کچھ پڑھ چکے ہیں لیکن عقیدے میں یہ الگ سے اس لیے بیان کیا جاتا ہے کیونکہ عقیدے میں ہم دلالت لزومی کا خیال نہیں کرتے۔ یعنی ہم نے پڑھ لیا کہ اللہ سمیع ہے تو خود ہی پتا چل گیا کہ غیر اللہ سمیع نہیں ہے۔ یہ اس کی دلالت لزومی ہے' اس سے یہ لازم آ رہا ہے۔ البتہ عقیدے کے باب میں ہم صرف اس پر اعتماد نہیں کرتے کہ سمجھ آ گئی ہوگی اور اس سے یہ لازم آ رہا ہے تو لوازم کو سمجھ لیا گیا ہوگا۔ ہم عقیدے میں بات کھول کر بیان کرتے ہیں اور یہ اہم بات ہے' کیونکہ عقیدے میں کسی قسم کا لفظ' کسی قسم کا دھوکا' کسی قسم کا اجمال ٹھیک نہیں ہے بلکہ وہاں تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ لہٰذا علمائے عقیدہ واجبات میں بھی بالواسطہ مستحیلات ہی کا بیان کر رہے ہوتے ہیں' اور مستحیلات میں آ کر بلاواسطہ مستحیلات ہی کا بیان کریں گے۔ اگر اجمالاً بتایا جائے تو ہم کہیں گے کہ جتنی صفات ہم پڑھ چکے ہیں ان صفات کی ضد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حق میں مستحیل ہے' کیونکہ وہ صفات جب واجب ہوگئیں تو پھر اس کی ضد مستحیل ہو جائے گی۔ البتہ جب ہم جائز صفات میں جائیں گے تو کہیں گے کہ یہ بھی اللہ کے حق میں ممکن ہے اور اس کی ضد بھی اللہ کے حق میں ممکن

ہے۔ گویا واجب صفات وہ ہیں کہ جن کی ضد لازماً مستغنی ہے فی حق اللہ تعالیٰ اور جائز صفات وہ ہیں کہ جہاں دونوں ممکن ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ارادے اور اختیار پر مبنی ہیں۔

اُمّ البراہین/ العقیدۃ الصُغریٰ

اب ہم اس کو شروع کرتے ہیں۔ کچھ چیزیں تو repeat ہوں گی اور کچھ اضافی بھی ہوں گی۔ اس میں جو کتاب آج منتخب کی گئی ہے وہ متن ہے اُمّ البراہین جس کو العقیدۃ الصغریٰ بھی کہتے ہیں اور یہ امام سنوسیؒ کی تالیف ہے۔ ''سنوسہ'' ایک بربر قبیلے کا نام ہے۔ اس کی طرف نسبت سنوسی ہے۔ یہ ایک بہت بڑے امام تھے جن کی بہت سی کتابیں ہیں' خصوصاً عقیدہ پر تو ایک بڑے متکلم مالکی شمار ہوتے ہیں۔ ان کا نام الامام محمد بن یوسف السنوسی الحسینی ہے۔ سید تھے' حسینی تھے اور ان کی وفات ۸۹۵ ہجری میں ہوئی ہے۔ انہوں نے تین کتابیں: العقیدۃ الکبریٰ' العقیدۃ الوسطیٰ اور العقیدۃ الصغریٰ لکھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی خود شرح بھی کی اور پھر بعد میں آنے والے علماء نے بھی کثرت سے ان کی شروح کی ہیں۔ ان میں سے ایک مختصر ترین متن جو انہوں نے عقیدے پر لکھا ہے وہ شمار ہوتا ہے العقیدۃ الصغریٰ جس کو ''اُمّ البراہین'' بھی کہتے ہیں۔ اس میں مختصراً اور عموماً ہم جیسے لوگوں کے لیے یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ کیا عقیدہ رکھنا ہے اور کیا نہیں رکھنا' جبکہ مختصر طور پر کچھ ادلہ بھی بیان کر دی گئی ہیں۔ انہوں نے ایک پورا باب قائم کیا اس موضوع پر کہ کیا کیا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حق میں مستحیل ہے۔ وہ چند باتیں' ان شاء اللہ' ہم دیکھیں گے۔ پھر ہم مختصراً یہی موضوع اور اس میں اہلِ سُنّت کا منہج امام غزالی علیہ الرحمہ کی کتاب ''الجام العوام من علم الکلام'' سے بھی' اِن شاء اللہ' دیکھیں گے۔

العدم' حدوث و مماثلۃ للحوادث: امام سنوسی

جو مستحیلات تفصیلاً ہیں اس میں پہلے بتاتے ہیں العدم' کیونکہ ہم نے صفت ذاتیہ ''صفت وجود'' پڑھی تھی تو امام سنوسی ''العدم'' کے بارے میں کہتے ہیں: وھو ضِدّ الوجود یہ وجود کی ضد ہے۔ وھو عبارۃ ان لا شیء اور یہ لاشیٔ سے عبارت ہے۔ فالوجود واجب لِلّٰہ سبحانہ وتعالیٰ والعدم مستحیل علیہ کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ واجب الوجود ہے یعنی اس کے لیے ''وجود'' کا ہونا ضروری ہے تو یقیناً وہاں ''عدم'' مستحیل ہوگا۔ لہٰذا یہ سب سے پہلی بات ہے' یعنی یہ بات مستحیل ہے کہ اللہ نہ ہو' یہ ناممکن ہے۔ اس کو ماننے کے نتیجے میں عقل کا توازن بگڑ جائے گا کہ اللہ نہ ہو۔ یہ عدم ہے' اور اللہ کے حق میں مستحیل ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: حدوث۔ حدوث کا مطلب ہے کوئی ایسی شے جو نہ ہونے کے بعد ہو جائے۔ اس بات کو تو اللہ کے فضل سے مسلمانوں میں سے کسی نے بھی نہیں مانا کہ اللہ کی ذات حادث ہے' کیونکہ حادث مانیں گے تو وہ خدا نہیں رہے گا۔ البتہ کچھ فرقے ایسے پیدا ہوتے چلے گئے جو مجسمہ اور مشبہہ کہلاتے ہیں کہ جنہوں نے کہا کہ اللہ کی صفات میں حدوث ہوتا رہتا ہے۔ گویا یہاں مسلمانوں کے اندر رہتے ہوئے اصل انکار اس بات کا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی کسی قسم کا کوئی حدوث نہیں ہے۔ کوئی صفت ایسی نہیں ہے جو نہ ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہو۔ امام طحاوی علیہ الرحمہ کی

عبارت کے مطابق مخلوق پیدا ہو جانے سے اس کی صفات میں اضافہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ صفات کے اعتبار سے بھی ازلاً کامل ہیں۔ چنانچہ وہاں حدوث مستحیل ہے۔ پھر اسی کی مانند ہے: المماثل للحوادث! یعنی یہ کہنا کہ وہ اپنی ذات میں حدوث تو نہیں ہے لیکن اُس کی ذات مانند یا مشابہ حوادث کے ہے۔ مثال کے طور پر آپ کہیں کہ نعوذ باللہ، اللہ جسم ہے، ہمیشہ سے تو ہے یعنی حادث نہیں ہے لیکن جسم ہے یا اس کے بھی ہاتھ، پاؤں، آنکھ ہمارے ہاتھ، پاؤں، آنکھوں کی طرح کے ہیں تو یہاں آپ اگرچہ حدوث تو نہیں مان رہے لیکن حدوث لازم آتا ہے۔ لازم اس طرح آئے گا کیونکہ جو بھی جسم ہوگا وہ حادث ہی ہوتا ہے۔ بالفرض اگر کوئی نہیں مانتا تو ہم کہیں گے مخالفة للحوادث۔ یہ اللہ کے حق میں واجب ہے تو گویا مشابہ یا مشابه للحوادث اللہ کے حق میں مستحیل ہو جائے گا۔ چنانچہ مماثلت اللہ کے حق میں مستحیل ہے۔ اللہ کسی مخلوق کے مانند نہیں ہو سکتا اور جو اللہ کو کسی مخلوق کے مانند کرے گا یا اللہ کو جسم بنائے گا یا جسم کی عبادت کرے گا تو بعض متکلمین یا علماءِ عقیدہ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اسے صریح کفر کہا ہے۔ خود امام غزالی علیہ الرحمہ ''اِلجام العوام'' میں کہتے ہیں کہ جو جسم کی عبادت کرتا ہے، اللہ کو جسم سمجھتا ہے اس نے اصلاً کفر کیا ہے۔ وہ ایک صنم کی عبادت کر رہا ہے، وہ بت کی عبادت کر رہا ہے۔ وہ جس کی عبادت کر رہا ہے وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نہیں ہے۔

تنزیہ میں مبالغہ مطلوب ہے

امام غزالی علیہ الرحمہ جس کتاب میں عوام الناس کو علم کلام سے روک رہے ہیں اسی میں بیان فرماتے ہیں کہ عوام الناس کے حق میں مبالغے کی حد تک یہ بات بیان کرنی ہے کہ اللہ تعالیٰ مخالف للحوادث ہے۔ اس لیے کہ ان کے ذہن میں یہ شبہات اور تشبیہات پیدا ہوتی رہتی ہیں اور عموماً وہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری ہی ایک بڑی پکچر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ علم الکلام سے روکنے کا مطلب ان باتوں سے روکنا نہیں ہے۔ یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ مبادا کوئی شخص انجانے میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو مخلوق کی مانند شمار کرتا رہے، یا اللہ کو زمان ومکان میں مانتا رہے، یا اللہ کو جسم مانتا رہے، یا اللہ کے حق میں ان باتوں کا اثبات کرتا رہے کہ جو مخلوقات کے خواص ہیں۔ ایسی صورت میں وہ جس کی عبادت کرتا ہے وہ اللہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک صنم ہے۔ وہ ایک جسم ہے جس کی وہ عبادت کر رہا ہے۔ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں تو ہم خواص ہیں۔ ہم عوام ہی کا عقیدہ یہاں پڑھ رہے ہیں اور عوام اور خواص کے عقیدے میں فرق کوئی نہیں ہے، صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ان کو گھول گھول کے یہ بات پلائی جائے کہ جو بھی تمہارے تصور اور خیال میں بنتا ہے وہ خدا نہیں ہوتا۔ جو عبارت ہے عقیدہ طحاویہ کی: کل ما خطر ببالک فاللّٰہ بخلاف ذٰلک یعنی جو بھی تمہارے خیال میں واقع ہو، وہ اللہ نہیں ہوتا۔ تصورات تو آتے ہیں لیکن اگر ساتھ ہی یہ بھی واضح رہے کہ جو بھی تمہارا تصور آتا ہے تم نے یہ اعتقاد رکھنا ہے کہ وہ خدا نہیں ہے تو الحمد للہ انسان ایک محفوظ جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ عموماً انسان کا تخیل حسیات سے پاک نہیں ہوتا اور وہ کسی نہ کسی طریقے پر خدا کا تخیل کر لیتا ہے، چنانچہ وسوسے کی حد تک تو چاہے کرے، بس اعتقاد یہ رکھے کہ کل ما خطر

ببالک فاللہ بخلاف ذٰلک! جو میرے خیال میں آتا ہے وہ اللہ نہیں ہوتا تو وہ شرک سے محفوظ رہے گا۔ وہ عبادتِ صنم سے نکل جائے گا‘ عبادتِ جسم سے نکل جائے گا۔

اللہ تعالیٰ: جسمانیت‘ زمان و مکان سے ماوراء

اس کے بعد امام سنوسی اسی کی تفصیل بتاتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حق میں یہ بات مستحیل ہے کہ عن تاخذ ذاتہ قدر من الفراغ ۔علم الکلام یا عقیدہ کی کتابوں میں آپ ایک لفظ پڑھیں گے کہ مخلوق متحیز ہوتی ہے جبکہ خدا تحیز سے ماوراء ہے۔ تحیز کا مطلب ہوتا ہے: جگہ گھیرنا۔ یہ جو dimensions ہیں یعنی چوڑائی رکھنا‘ بُعد رکھنا‘ طوالت رکھنا یہ ساری چیزیں فراغ کو گھیرنا ہے۔ یعنی ایک خلا تھا جس کو آپ گھیر لیتے ہیں۔ جو کسی جگہ کو گھیرے گا اس وجود کو علم الکلام کی اصطلاح میں متحیز کہتے ہیں۔ ہم سب متحیز ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حق میں یہ بات مستحیل ہے۔ آپ کہیں گے یہ کیسے ہوسکتا ہے‘ یہ تو تخیل میں نہیں آتا کہ وجود ہو اور جگہ نہ گھیرے۔ دراصل اللہ تعالیٰ جگہ سے ماوراء ہے۔ یعنی ہم یہ بات مانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ زمان اور مکان سے ماوراء ہے اور ہماری عقل اور ہمارا تخیل حسیات میں گھرے رہنے کی وجہ سے ایسے وجود کا تصور نہیں کر پاتا کہ جو فراغ نہ گھیرتا ہو‘ جو جگہ نہ گھیرتا ہو۔ یہ بھی نہ سمجھیے کہ ہوتا تو وہ جگہ میں ہے لیکن جگہ نہیں گھیرتا‘ بہت چھوٹا ہے‘ نعوذ باللہ! نہیں‘ وہ جگہ ہی میں نہیں ہوتا۔ وہ زمان و مکان سے ماوراء ہوتا ہے۔ تو کہتے ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ متحیز نہیں ہے۔ جب وہ متحیز نہیں ہے تو جسم بھی نہیں ہوسکتا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: فیستحیل علیه تعالیٰ ان یکون جرما (جسم) او یکون عرضا یکون بالجرم۔ دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک کو کہتے ہیں جسم یا جوہر۔ ان میں تھوڑا فرق یہی ہے کہ ایک سے زیادہ جوہر مل کے جسم بناتے ہیں۔ ایک عرض ہوتی ہے۔ جوہر وہ ہوتا ہے جو کسی محل میں نہیں ہوتا۔ صفت یا عرض وہ ہوتی ہے جس کو قائم رکھنے کے لیے محل درکار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ میز ہے جو کسی اور شے کی بنیاد پر وجود نہیں رکھ رہی ہے لیکن رنگ اور حجم کی جو صفات اس کے اندر پائی جاتی ہیں یہ میز کے بغیر نہیں پائی جاسکتیں۔ لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نہ جسم ہے نہ جسم کی کوئی صفت ہے۔ یہ خلاصہ ہے اس کا کہ مستحیل ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جَرم ہو یا عرض ہو۔ جب وہ جگہ نہیں گھیرتا (نعوذ باللہ)‘ وہ جگہ میں ہے ہی نہیں تو وہ جسم بھی نہیں ہے۔ جسم نہیں ہے تو جسم پر وارد ہونے والی صفت بھی نہیں ہے۔ نہ وہ جسم ہے‘ نہ جَرم ہے اور نہ وہ عرض ہے۔ اس کو متکلمین کہتے ہیں کہ نہ وہ جوہر ہے نہ وہ جسم ہے اور نہ وہ عرض ہے۔ یہ بھی ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ کا بیان ہے۔

اللہ تعالیٰ: حدود و جہات سے ماوراء

اس کے بعد اگلی مستحیل بات بھی اصل میں مخالفۃ للحوادث ہی کی تفصیلات ہیں۔ یہ تو ہم نے کہہ دیا کہ وہ جَرم نہیں ہے‘ جسم نہیں ہے اور وہ صفت بھی نہیں ہے جو کسی جسم کے اندر پائی جاتی ہے۔ پھر کوئی اگر یہ کہہ دے کہ وہ خود تو جَرم نہیں ہے لیکن جسم کی کسی جہت میں ہے! فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان جہاتِ ستّہ سے یعنی آگے پیچھے‘

دائیں بائیں اور اوپر نیچے سے ماوراء ہے‘ اس لیے کہ جہت کا تصور بغیر مکان کے اور جسم کے نہیں ہے۔ لہٰذا جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے جسمانیت‘ مکانیت اور زمانیت سب کی نفی کر دی تو جہت کی بھی نفی ہوگئی۔ کہتے ہیں:

یستحیل علی اللّٰہ تعالی ان یکون فی جھت للجرم بان یکون فوق العرش مثلًا او تحته او یمینه او شماله او امامه اوخلفه لان اللّٰہ تعالیٰ لو کان فی جھة لکان جسما او جرما

یہ نہ سمجھ لینا کہ اللہ عرش کے اوپر ہے‘ یا دائیں ہے‘ یا بائیں ہے‘ یا نیچے ہے‘ یا آگے ہے۔ اگر اللہ جہت میں ہوتا تو جسم ہوتا جبکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جسمانیت سے ماوراء ہے‘ مکانیت سے ماوراء ہے۔ اس میں اشکال یہ ہوگا کہ فوق العرش یا مستوی علی العرش کا لفظ آیا تو یہ بات درست ہے‘ لیکن جیسے امام غزالی فرماتے ہیں: اللہ کے لیے لفظ فوق تو آتا ہے لیکن فوق کبھی جسم کے اعتبار سے ہوتا ہے کبھی قدر و منزلت یا رتبے کے لیے ہوتا ہے۔ تو اللہ کے حق میں جسمانیت اور یہ ساری چیزیں مستحیل ہیں‘ لہٰذا جب بھی فوق کا لفظ آئے گا تو وہ کبھی بھی جسمانیت پر محمول نہیں کیا جائے گا کیونکہ دلائل قطعی سے جسمانیت کی نفی اور جہت کی نفی ثابت ہو چکی ہے۔ یوں نہ سمجھیے گا کہ یہ باتیں ابھی کسی نے بنائی ہیں۔ یہی عبارت ’’عقیدہ طحاویہ‘‘ میں امام طحاوی علیہ الرحمہ نے بیان کی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: وتعالیٰ عن الحدود والغایات اللہ سبحانہ وتعالیٰ حد سے اور غایت سے ماوراء ہے۔ غایت وہ جگہ ہوتی ہے جہاں پہنچ کر کوئی شے ختم ہو جاتی ہے۔ جب مکان سے ماوراء ہے تو اس کی حد اور غایت نہیں ہے۔ اب کہیں اللہ کی کوئی حد نہیں ہے‘ وہ لامحدود ہے۔ لامحدود کا مطلب ہمارے ذہن میں یہ آئے گا کہ ایک چیز چلتی چلی جا رہی ہے‘ ختم ہی نہیں ہو رہی۔ یعنی ہمارے ذہن میں لامحدودیت کا تصور بھی آئے گا تو ہم ایک فزیکل شے ہی کو تصور کریں گے کہ یہ چیز ہے جو چلتی جا رہی ہے اور never ending ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اعتبار سے یہ معنی نہیں ہوگا۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ جسم نہیں ہے‘ وہ مکان میں نہیں ہے۔ حدود اور غایات تو مکان سے طے ہوتی ہیں‘ لہٰذا وہ حدود اور غایات سے ماوراء ہے۔ بہرحال امام طحاوی ’’عقیدہ طحاویہ‘‘ میں فرماتے ہیں: وتعالی عن الحدود والغایات یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ حدود اور غایات سے ماوراء ہے۔ والارکان والاعضاء رکن کسی شے کا جز ہونا اور اعضاء سے بھی ماوراء ہے۔ والادوات: اور آلات سے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے فعل میں کوئی آلہ نہیں ہوتا‘ جیسے ہمارے افعال میں دیکھنے کا فعل ہے تو ایک آلہ لگا ہوا ہے‘ اس کو ادوات کہتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں: لا تحویة الجھات الستة چھ جہات اللہ کا احاطہ نہیں کرتیں‘ یعنی اللہ کسی جہت میں نہیں ہے۔ بہت سے بزرگوں کو میں نے پڑھا وہ کہتے ہیں یہ بات تو کوئی عامی تسلیم ہی نہیں کر سکتا‘ یعنی یہ بات تسلیم کرنا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مکان سے اس طرح ماوراء ہے‘ کیونکہ یہ عقیدے کی جو عبارت ہمارے ہاں پڑھائی جاتی ہے وہ یہ ہے:

لا داخل العالم ولا خارجه ولا تحته ولا فوقه ولا یمینه ولا شماله ولا خلفه

اللہ تعالیٰ نہ اس عالم میں ہے نہ اس سے باہر ہے۔ اب اس کا مطلب یہ نہیں کہ حلول ہے‘ لیکن داخل اور خارج خود مکان کی صفات ہیں اس لیے نفی ہو رہی ہے۔ جیسے ابن تیمیہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ یہ تو عدم ہوتا ہے یعنی جس کو تم

یوں کہتے ہو یہ تو عدم ہے۔ تم نے عدم کو بھی بیان کرنا ہے تو ایسے بیان کرو گے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ فطرت اس کو نہیں مان سکتی۔ ایک عام آدمی اس کو کبھی تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوسکتا۔ یہ ابن تیمیہؒ کا دعویٰ تھا۔ ویسے جس بھی عام آدمی کو یہ بات بتائی گئی ہے اس کو سمجھ آ جاتی ہے، وہ تسلیم کر لیتا ہے۔ میں نے کسی عام آدمی کو نہیں دیکھا کہ وہ کہہ رہا ہو کہ یہ بات تو ہو ہی نہیں سکتی۔ جب اس کو سمجھایا جاتا ہے کہ مکان اور جسم کا کیا مطلب ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ ماوراء اس لیے ہیں کیونکہ یہ حدوث ہے تو وہ فوراً تسلیم کر لیتا ہے کہ بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾! چنانچہ ان کا دعویٰ تھا کہ یہ بات فطرت قبول نہیں کر سکتی۔ یعنی میں عام آدمی ہوں تو مجھے اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ جب میں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بارے میں یہ مان لیا ہے کہ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ تو میں یہی بتانا چاہ رہا ہوں کہ جو چیزیں نظر آتی ہیں وہ داخل العالم اور خارج ہوتی ہیں جبکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کے مانند ہی نہیں ہیں، وہ تو وجود کی ایک اور ہی نوع ہیں۔ اس کے وجود میں کوئی بھی اس کے مانند نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی صفات بھی بس اسی کے ساتھ خاص ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ آپ کہیں یہ تو طلسماتی یا جادوئی قسم کی باتیں ہیں اور سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہی بتایا ہے کہ اس کے مانند کوئی نہیں ہے۔ بہر حال یہاں وہ بتا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جہت میں نہیں ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رویت: بلا جہت

یہاں سے ایک اور مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ جہت میں نہیں ہے تو رویت نہیں ہوگی۔ لہٰذا اہلِ سُنّت کے سوا معتزلہ، زیدی، اثنا عشرہ جیسے فرقے نہیں مانتے کہ اللہ کی رویت ہوگی کیوں کہ وہ جہت میں نہیں ہے۔ رویت کے لیے ان کے ہاں شرط جہت ہے، لہٰذا انکار کر دیا۔ اہلِ سُنّت کے اندر جو تجسیم والے کچھ ٹرینڈ تھے، انہوں نے کہا کہ رویت ہوگی تو جہت ہوگی۔ رویت تو احادیث سے ثابت ہے، اس کا تو ہم انکار نہیں کر سکتے۔ رویت کا مطلب ہے قیامت کے دن اللہ کو دیکھیں گے۔ رویت جہت کے بغیر نہیں ہوتی۔ رائی اور مرئی۔ رائی دیکھنے والا اور مرئی جس کو دیکھا جا رہا ہے۔ رائی اور مرئی ایک خاص جہت میں ہوں گے تو ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اللہ کے فضل سے اہلِ سُنّت نے نہ رویت کا انکار کیا نہ یہ کہا کہ رویت جہت میں ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ جہت سے اللہ تعالیٰ ماوراء ہے لیکن رویت پھر بھی ہوگی اور جہت میں ہونا عادی شرط ہے، عقلی شرط نہیں ہے۔ یعنی اگر رویت ہو اور جہت میں نہ ہو تو اس سے عقل کے قوانین نہیں ٹوٹتے، بس عادت کے قوانین ٹوٹتے ہیں۔ البتہ رویت کے لیے ایک شرط ضروری ہے اور وہ ہے وجود۔ عدم کی رویت نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے اور وجود میں اتم اور اکمل ہے، لہٰذا اس کی رویت ہو سکتی ہے۔ جب صادق اور مصدوق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بتا دیا تو ہوگی اور عقلاً جائز ہے، لہٰذا اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ رویت ہوگی لیکن وہ جہت میں نہیں ہوگی۔ وہ ایک ایسی رویت ہے جس کا ابھی ہم تصور نہیں کر سکتے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے کہا بھی ہے کہ وہ ادراک میں نہیں آتا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے (جنت کے بارے میں) فرمایا:

((مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ)) (صحیح مسلم:۷۱۳۴)
’’جو نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا‘ نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی قلب بشر پر اس کا گمان بھی گزرا۔‘‘

وہ ایسی رویت ہوگی جو اس وقت بشر کے قلب پر وارد نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا وہ رویت بھی ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ ہوگی۔ اس کے بھی مانند کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا رویت ماننے کے لیے جہت یعنی اللہ کو کسی dimension میں ماننا ضروری نہیں ہے۔ یہ بات بھی وہ فرما رہے ہیں کہ اس طرح نہ سمجھ لینا کہ جس طرح ایک مکان کے اوپر ایک مکان ہوتا ہے اور ایک جگہ سے فاصلے پر کچھ جگہ ہے تو ہم یہاں بیٹھے ہیں تو اللہ‘ نعوذ باللہ‘ وہاں بیٹھا ہے۔ اس طرح کا تصور نہیں ہے۔ یہ ایک بچگانہ سی بات ہے۔ ایک تو ہے کہ اللہ ہم سے کسی جہت میں ہو‘ یہ بھی نہیں ہے۔ یا اللہ ہمارے اعتبار سے تو جہت میں نہیں لیکن اس کی اپنی جہات ہوں‘ یعنی اس کا ایک دایاں ہے‘ اس کا ایک بایاں ہے‘ وہ طول اور عرض رکھتا ہے‘ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی ماوراء ہے۔ صرف ہم سے جہت ماوراء نہیں ہے بلکہ اس کی ذات جہت میں نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ جسمانیت کی شرائط ہیں۔ اب کہتے ہیں: ویستحیل علی سبحانہ وتعالیٰ ان تکون لہ جھت فی نفسہ یعنی بان یکون لہ یمین او شمال او فوق او تحت او قدام او خلف یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ لانہ لو کان کذلک لکان جرما ای جسما یعنی اگر ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جہات ہوں تو وہ جسم ہو جائے گا اور یہ مستحیل ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ذات کا لفظ جائز

اس کے بعد ایک ملاحظہ انہوں نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہم جسم وغیرہ کا لفظ تو نہیں بولتے البتہ ذات کا لفظ جائز ہے۔ ذات سے جسمانیت لازم نہیں آتی‘ ذات بس اس وجود کے تحقق‘ اس کے ثبوت اور اس کے واقع ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ پھر وہ مشہور واقعہ جب حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تھے اور انہوں نے اس موقع پر ایک شعر پڑھا تھا۔ جب ان کو مشرکین مکہ پکڑ کر لے گئے اور ان کو سولی پر چڑھایا گیا تو انہوں نے کہا کہ پہلے میں دو رکعت پڑھوں گا۔ پھر ان سے پوچھا گیا کہ: کیا تم یہ پسند کرو گے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہاری جگہ ہوتے اور تم اپنے گھر میں ہوتے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں یہ بات بھی پسند نہیں کرتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک کانٹا بھی چبھے۔ میں نے دو رکعات اتنی جلدی اس لیے پڑھیں کہ تم یہ نہ کہو کہ موت کے خوف سے نماز طویل کر دی۔ پھر انہوں نے یہ شعر پڑھا تھا جس میں ذات کا لفظ آ رہا ہے۔ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک یہ شعر پہنچا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو سُنّت تقریری عطا فرما دی۔ چنانچہ پتا یہ چلا کہ لفظ ذات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حق میں بولا جا سکتا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

فَلستُ أُبالي حين أُقْتَلُ مُسلِمًا   علٰى أيِّ جَنْبٍ كان لِلّٰهِ مَصرَعِي
وذٰلك في ذاتِ الْإلٰهِ وَإِنْ يَشَأْ   يُبارِكْ علٰى أوصَالِ شِلْوٍ مُمزَّعِ

(صحیح البخاری‘ کتاب التوحید‘ ح:۷۴۰۲)

’’مجھے کوئی پروانہیں ہے جب حالت اسلام میں مجھے شہید کیا جائے کہ میں کٹنے کے بعد یا گردن اڑنے کے بعد اللہ کی راہ میں دائیں گرتا ہوں یا بائیں گرتا ہوں۔ اور یہ سب اللہ کی ذات کی رضا کے لیے ہے۔ اور اگر اللہ چاہے کہ میرے مرنے کے بعد میری ہڈیوں اور کھال وغیرہ پر بھی برکت نازل فرمادے تو وہ اس پر قادر ہے۔‘‘

کہتے ہیں وقد سمع النبیﷺ ھذاالشعر وأقر یعنی اللہ کے نبی ﷺ نے یہ شعر سنا اور اقرار فرمادیا۔ اس کو ہم سُنّت تقریری کہتے ہیں۔

اس کے بعد امام سنوسیؒ فرماتے ہیں: ویستحیل علی اللہ تعالیٰ ان یتقید من مکان اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حق میں یہ بات مستحیل ہے کہ وہ کسی مکان میں مقید ہو جائے۔ یعنی زمان کی باری بھی آگے آئے گی، ابھی مکان کی بات کر رہے ہیں۔ والمراد بالمکان استقرار الجرم علی الجرم یعنی جسم کا جسم پر ہونا یا جسم کا کسی جسم سے جہت میں ہونا، یہ مکان ہے اور مکان کی تعریفات میں کافی اختلاف ہے۔ فلاسفہ کی ایک الگ تعریف ہے جبکہ اہلِ سُنّت متکلمین کی ایک الگ تعریف ہے۔ وہ تعریف یہ ہے: فراغ موھوم ایک وہمی جگہ ہوتی ہے جس کو جسم گھیرتا ہے۔ اب اس وقت وہ جگہ جہاں میرا جسم نہیں ہے، یہ فراغ وہمی ہے۔ یہاں میں آؤں گا تو جسم ادھر آجائے گا۔ یہ فراغ وہمی کہ جس کو جسم گھیرتا ہے اس کو مکان کہتے ہیں۔ گویا مکان کے لیے جسم ضروری ہے یا جسم کی جہات ضروری ہیں۔ فرمارہے ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ متقید بالمکان نہیں ہے۔ لان اللہ لو کان لہ مکان لکان جرما کہ اللہ کے لیے اگر مکان ہوتا تو وہ جسم ہوتا۔ وہی بات ہے یعنی یہ سب اصلاً جسمانیت کی نفی کرنے کے بعد اس کی فروعات ہیں۔

تفصیلات ضرورت سے پیدا ہوتی ہیں

عقیدے میں دلالت التزامی کفایت نہیں کرتی، تفصیل سے ہر شے کو الگ الگ بتایا جاتا ہے۔ ورنہ تو اگر جس نے سمجھ لیا کہ اللہ جسم نہیں ہے وہ ساری باتیں سمجھ لے گا۔ اس کو پھر بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ مکان میں نہیں ہے، زمان میں نہیں ہے، اوپر نہیں ہے، جہت میں نہیں ہے۔ وہ سب باتیں سمجھ سکتا ہے صرف اس بات کی نفی سے کہ اللہ جسم نہیں ہے۔ یہاں سے ہمیں اس اعتراض کا جواب سمجھنے میں بھی مدد مل سکتی ہے کہ یہ ساری چیزیں ہمیں قرآن میں تو اس طرح نہیں ملتیں، حدیث میں بھی نہیں ملتیں کہ مستحیل ہے اللہ پر یہ بھی اور مستحیل ہے اللہ پر وہ بھی۔ اس کا علماء نے جواب یہ دیا کہ یہ باتیں ہمیں بھی تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت اس وقت پیش آگئی کہ جب مجسمہ اور مشبہہ جیسے گروہ پیدا ہو گئے۔ جس زمانے میں گروہ پیدا نہیں ہوئے تھے تو محض ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ سے بھی عرب اپنے سلیقہ عبارت سے یہی بات سمجھ لیتے تھے۔ کچھ مجمل عبارتوں سے انہیں تفصیلات سمجھ آجاتی تھیں۔ ہمیں ان مجمل عبارتوں کی تفصیلات بیان کرنی پڑیں کچھ ایسے فرقوں کے ظہور کی وجہ سے کہ جنہوں نے اللہ کے حق میں ان باتوں کی نسبت کر دی کہ جو ان آیات کے اجمال کے برعکس تھیں۔ پھر ہم نے اس کے اندر تفصیل پیدا کر دی۔ چنانچہ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ قرآن کا منہج نہیں ہے۔ منہج ضرورت کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ یعنی آج

اگر کوئی خاص قسم کی گمراہی آ جائے جیسے ختمِ نبوت کا انکار ہو جائے تو آپ کہیں گے قرآن میں تو ایک ہی آیت آئی ہے اور تم نے اپنا سارا وقت اسی پر خرچ کیا ہوا ہے‘ اسی کی تفصیلات بیان کر رہے ہو‘ سارا دین ختم نبوت ہی ہے کیا! ہم کہیں گے کہ اس وقت کی ضرورت ہے۔ختمِ نبوت دین کا ایک جزو ہے۔ معلوم من الدین بالضرورة ہے۔ اس وقت ایک فرقہ ضالہ وجود میں آ چکا ہے تو اب ہم اپنی توانائیاں اس کام میں صرف کر رہے ہیں۔علماء کے اس کام کو بھی اسی اعتبار سے دیکھیں تو بات واضح ہو جائے گی کہ جس زمانے میں یہ لوگ ہیں‘ اس زمانے میں مجسمہ اور مشبہہ (جیسے ابھی بھی پائے جاتے ہیں) غلبہ رکھتے ہیں اور عوام الناس کو گمراہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ کیا کیا باتیں مانی ہیں‘ کیا کیا باتیں نہیں مانی۔ اس طرح کے اعتراضات بچگانہ ہوتے ہیں۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ بات بھی ملاحظہ کرلو کہ ان نفی المکان یستلزم نفی الحدود لذات اللہ تعالیٰ کما نص علیه اهل السنة جیسا کہ اہلِ سُنّت نے نصاً بیان کیا ہے کہ نفی مکان سے اللہ کے لیے نفی حدود بھی لازم آتا ہے۔حد کا مطلب ہی مکان کا ہونا ہے۔جو شے غیر مکانی ہے‘ اس کے لیے حد کا اثبات نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ: مرورِ زمان سے منزہ

اس کے بعد فرماتے ہیں: ویستحیل علی اللہ زمان ، اللہ تعالیٰ پر زمان بھی مستحیل ہے۔فیستحیل علیه ان یمر علیه الزمان اللہ تعالیٰ پر یہ بات مستحیل ہے کہ اس پر زمان گزرے‘ وقت گزرے۔ یہ زمان کیا ہے؟ اس پر ہمارے علماءِ کلام کی کتابوں میں بہت تفصیل ہے۔ یہاں تک کہ بعض متکلمین نے کہا کہ یہ مواقف العقول میں سے ہے۔مواقف العقول کا مطلب ہوتا ہے جہاں پہنچ کر عقل وقف کرے کہ سمجھ نہیں آ رہی۔ کچھ نے کہا یہ بدیہی ہے‘ اس لیے تو عقل وقف کرتی ہے۔سب کے ہاں یہ بات متفق علیہ ہے کہ زمان بلا مکان نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب زمان بلا مکان نہیں ہے اور زمان اللہ کی مخلوقات میں سے ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی تمام مخلوقات سے ماوراء ہیں۔لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نہ مکان میں ہیں نہ زمان ان پر گزرتا ہے۔ یہاں بہت سی باتیں جو ہمیں تنگ کرتی ہیں اور دوسرے بہت سے مسئلے حل ہو جاتے ہیں اور ایک عجیب لطف حاصل ہوتا ہے۔ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یہ بات لکھی ہوئی ہے‘ ہمیشہ سے اس کے ہاں سب طے ہے‘ یہ بات درست ہے لیکن ہمیشگی کا جو مفہوم ہمارے ہاں ہے وہ زمان کے بغیر نہیں ہوتا۔یعنی اللہ تعالیٰ نے ہم سے اتنا پہلے یہ بات طے کر لی ہے‘ وہاں اس طرح کا حساب کتاب نہیں ہے۔ وہاں زمان ہی نہیں ہے‘ وہ زمان سے ماوراء ہے۔لہٰذا ہر شے وہاں پر طے ہے لیکن وہ اس طرح طے نہیں ہے کہ جیسے آپ نے دس دن پہلے طے کیا ہو بلکہ زمان سے ماوراء طے ہے۔لہٰذا آپ دعا کریں گے تو کچھ بھی ہو جائے گا۔یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے مانگیں تو اس طرح سوچ کر نہ مانگیں کہ اللہ نے تو پہلے سے طے کر دیا تو مانگنے کا کیا فائدہ! اللہ کے ہاں پہلے اور بعد نہیں ہے۔اللہ کے ہاں زمان ہی نہیں ہے‘ جیسے ابھی ہم نے عبارت پڑھی: فیستحیل علیه ان یمر علیه الزمان مستحیل ہے کہ اللہ پر زمان گزرے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ: حرکت وسکون سے ماوراء

اس کے بعد فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ پر یہ بات مستحیل ہے کہ ان تتصف ذاته العليا بالصفات الحادثة کہ اُس کی ذاتِ عالی متصف ہو حادث صفات سے مثل الحركة والسكون وغيرهما جیسا کہ حرکت اور سکون۔ کوئی شخص کہے کہ یا تو چیز متحرک ہوگی یا ساکن ہوگی' کوئی تیسری کیفیت ہو تو گویا ارتفاعِ نقیضین والی صورت حال ہے۔ ساکن وہ شے ہوتی ہے جو قابل تحرک ہوتی ہے اور حرکت کا مطلب ہے انتقال من مكان الى مكان ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف انتقال۔ جب ہم نے جسمانیت' مکانیت اور ان سب باتوں کی نفی کر دی ہے تو حرکت اور سکون دونوں کی نفی ہو جاتی ہے۔ منطق میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ارتفاعِ نقیضین اس شے سے ہوسکتا ہے کہ جو شے اس کے قبول کی صلاحیت ہی نہ رکھتی ہو' جو شے اس نقص کے قبول کی صلاحیت سے منزہ ہو۔ مثال کے طور پر آپ دیوار کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ عالم ہے یا غیر عالم ہے کیونکہ دیوار کے اندر علم کی صلاحیت نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں سے دونوں نقیضین مرتفع ہو جائیں گی' علم اور غیر علم یا لاعلم۔ اب یہ تو دیوار کے نقص کی وجہ سے ہے کہ دیوار علم قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی لیکن ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی شے اپنے بلند مرتبے اور عظمت کی وجہ سے کوئی نقص کی صفت یا اس کی ضد قبول کرنے سے منزہ ہو۔ اللہ تعالیٰ حرکت اور سکون سے منزہ ہے۔ وہاں نقیضین کا سوال نہیں ہوگا۔ پھر ہم ان آیات یا روایات کے بارے میں بھی یہی کہیں گے جہاں بظاہر کوئی حرکت معلوم ہوتی ہے کہ یہاں ایک مکان سے دوسرے مکان میں انتقال مراد نہیں ہے۔ یہ ہم ان شاءاللہ ''إلجام العوام'' میں دیکھیں گے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب طے ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ مکانی نہیں ہے تو مثلاً نزول بھی مکانی نہیں ہے۔ نزول وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے لائق ہے' مکانی نہیں ہے۔ مکان کی نفی ہو چکی ہے' لہٰذا نزول کو لازماً مکان ماننا ضروری نہیں ہوتا۔ امام غزالیؒ نے امام شافعیؒ کا ایک قول نقل کیا کہ نزلت في بغداد ثم نزلت ثم نزلت ثم نزلت میں بغداد میں اُترا' پھر مزید اُترا' پھر مزید اُترا (مزید اُترنے سے مراد ہے پھر کچھ عرصہ مزید رہا)۔ یعنی نزول کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بغداد کی زمین میں نیچے ہی کہیں اترتے چلے گئے۔ لہٰذا نزول بہت مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ذات کے اعتبار سے دیکھا جائے گا تو جب اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ہم یہ بات طے کر چکے ہیں کہ وہ زمانی اور مکانی نہیں ہے تو اس کا نزول بھی زمانی اور مکانی نہیں۔

آگے فرماتے ہیں: ويستحيل ان تتصف ذاته العالية بالصغر او الكبر چھوٹا بڑا ہونا' اس سے بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذاتِ عالی ماوراء ہے۔ ''اللہ اکبر'' کا مطلب ہر شے سے بڑا ہے' جسمانی اعتبار سے (نعوذ باللہ) نہیں بلکہ یہ ذات کے اعتبار سے ہے' منزلت کے اعتبار سے ہے' صفات کے اعتبار سے ہے' قوت اور قدرت کے اعتبار سے ہے' وجود کے اعتبار سے ہے۔ چنانچہ کبر اور صغر بھی جسمانی نہیں ہوگا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جز واور کُل اور اس طرح کی اصطلاحات جو مخلوقات کے لیے وضع کی گئی ہیں' ان سب سے ماوراء اور منزّہ ہے۔

اللہ تعالیٰ: غرض و غایت سے ماوراء

اس کے بعد فرماتے ہیں: ویستحیل علی اللہ تعالٰی ان یتصف بالاغراض اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر یہ بات مستحیل ہے کہ اس کی ذات غرض سے متصف ہو جائے‘ چاہے وہ غرض اس کے افعال میں ہو یا اس کے احکام میں۔ اللہ تعالیٰ کے افعال وہ ہیں جو وہ اس وقت تکوینی طور پر فرما رہے ہیں کہ کسی کو زندہ کر رہے ہیں‘ کسی کو مار رہے ہیں‘ کسی کو عزت دے رہے ہیں‘ کسی کو ذلت دے رہے ہیں۔ کائنات چل رہی ہے۔ تدبیرِ امر ہو رہی ہے۔ کسی کو فقیر کر رہے ہیں‘ کسی کو غنی کر رہے ہیں۔ یہ سب اللہ کے افعال ہیں‘ اور احکام سے مراد حکم شرعی ہے۔ یعنی ایک حکم تکوینی ہے جو اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں اور ایک حکم شرعی ہے کہ یہ شے واجب ہے‘ یہ شے حلال ہے‘ یہ شے حرام ہے‘ یہ شے مکروہ ہے اور یہ شے مباح ہے۔ ان دونوں میں اللہ تعالیٰ غرض و غایت سے ماوراء ہے۔ غرض کی تعریف انہوں نے خود کی کہ والاغراض جمع الغرض وھوالباعث للفعل آپ کو فعل پر ابھارنے والی شے غرض ہوتی ہے۔ اس کو علت غائیہ کہتے ہیں۔ ارسطو کی جو چار علتیں ہیں ان میں سے علت غائیہ ذہن میں پہلے ہوتی ہے‘ وجود میں بعد میں آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ فعل میں نہ حکم میں کوئی غرض رکھتے ہیں‘ ایسی غرض جو ان کی ذات کی طرف لوٹتی ہو۔ جو بھی غرض ہوتی ہے وہ مخلوق کی طرف لوٹتی ہے۔ اللہ کو کوئی غرض نہیں ہوتی۔ یعنی اللہ نے نماز پڑھنے کا کہا‘ یہ حکم ہے تو اللہ کو اس حکم کے دینے پر کسی باعث (اُبھارنے والی شے) نے نہیں اُبھارا کہ یہ غرض حاصل ہو جائے گی۔ اسی طریقے پر اللہ نے کائنات بنائی ہے تو یہ اللہ کا فعل ہے۔ انسان بنایا تو یہ اللہ کا فعل ہے۔ اللہ کو اس فعل پر ابھارنے والی کوئی غرض نہیں تھی جو اللہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بہر حال اللہ سبحانہ وتعالیٰ غرض سے ماوراء ہے‘ وہ غرض چاہے فعل میں ہو چاہے احکامِ شرعیہ میں۔ تکوین وتشریع دونوں میں اللہ کی کوئی غرض نہیں ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس سے تو عبث لازم آتا ہے۔ ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا﴾ تو فرمایا کہ عبث اس وقت لازم آتا ہے جب جس شے کو پیدا کیا گیا ہو اور اس کے لیے کچھ اغراض نہ رکھی ہوں۔ یعنی ہمیں تو پیدا کیا لیکن اللہ ہمارے پیدا کرنے سے خود کچھ نہیں لے رہا بلکہ ہمیں کچھ دے رہا ہے۔ ہمیں اُس نے کچھ کہا ہے کہ یہ کام کرو‘ اس میں تمہارا کمال ہے‘ اس میں تمہاری ترقی ہے۔ عبث اس وقت ہوتا ہے کہ اگر اللہ پیدا کرنے کے بعد انسان کو بھی شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیتا‘ جیسے فرمایا:

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّاَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾﴾ (المؤمنون)

’’کیا تم نے سمجھا تھا کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کیا تھا اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے؟‘‘

یعنی تمہارا وجود تمہاری ذات میں بے مقصد نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی غرض حاصل نہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ عبث نہیں ہے۔

❁❁❁

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: حافظ خالد محمود خضر

نام کتاب : لغات واعراب قرآن کی روشنی میں
ترجمہ قرآن کی لغوی ونحوی بنیادیں

تالیف : پروفیسر حافظ احمد یارؒ

اہتمام طباعت : ڈاکٹر نعم العبد بن حافظ احمد یارؒ

ناشر : الفیصل' ناشران وتاجرانِ کتب' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور

صفحات : ۱۲۱۸' قیمت: ۳۰۰۰ روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ خدام القرآن' K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 0301-1115348

استاذِ مکرم پروفیسر حافظ احمد یار رحمہ اللہ تعالیٰ کا متعلّم ہونا اور اُن کی تدریس سے فیض یاب ہونا میری زندگی کی خوبصورت یادوں میں سے ہے۔ آج اس کا تذکرہ گویا عمرِ رفتہ کو آواز دینے کے مترادف ہے۔ یہ چالیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں ۱۹۸۴ء میں قرآن اکیڈمی لاہور کی فیلوشپ سکیم سے وابستہ ہوا تھا۔ انہی دنوں محترم حافظ صاحبؒ پنجاب یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد قرآن اکیڈمی میں بحیثیت استاد تشریف لے آئے تھے۔ چنانچہ قرآن اکیڈمی کے دوسالہ کورس میں حافظ صاحبؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا۔ اس کلاس میں مدارسِ عربیہ کی طرح فرشی نشست کا اہتمام ہوتا تھا۔ حافظ صاحبؒ محترم کے دو پیریڈ مسلسل ہوتے تھے' جن میں پہلے سال کے دوران ہمیں عربی صرف ونحو کا وہ نصاب پڑھایا گیا جو ترجمہ قرآن میں لغات اور اعراب کی بحث سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ مدارس عربیہ کے برعکس حافظ صاحبؒ نے تدریس کا آغاز ''نحو'' سے کیا اور اسم کی اعرابی حالتوں (رفع' نصب' جر) سے روشناس کرایا۔ اگرچہ اس سے قبل میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے بنیادی عربی کورسز کر چکا تھا' لیکن ''اِعراب'' سے متعلق تصورات حافظ صاحب کی تدریس ہی سے واضح ہوئے۔ قرآن اکیڈمی کے رجوع الی القرآن کورس کے طلبہ کو ''اِعراب'' کا یہ concept بہت اچھی طرح واضح کرا دیا جاتا ہے ورنہ اکثر مدرّسین تک کو معلوم نہیں ہوتا کہ ''اعراب'' کس بلا کا نام ہے۔ وہ تو فقط ضمہ' فتحہ اور کسرہ (پیش' زبر اور زیر) ہی کو اعراب سمجھ کر اسی کی تدریس کر رہے ہوتے ہیں۔ بعض حضرات کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ رفع' نصب' جر اسم

کی ہوتی ہے یا فعل کی! بہر حال لغات اور اعراب کی بحث سمجھنے کے لیے ایک خاص سطح تک عربی صرف ونحو کے قواعد سے جو واقفیت ضروری ہے وہ ہمیں محترم حافظ صاحبؒ کی سال بھر کی تدریس سے حاصل ہوئی۔

دوسرے سال میں استاذِ مکرمؒ نے ہمیں پورے قرآن کریم کا ترجمہ صرفی ونحوی تحلیل اور لغات و اعراب کے حوالے سے پڑھایا۔ ہمارے سیشن (۱۹۸۴۔۸۶ء) کے بعد ''دوسالہ کورس'' کے کئی سیشنز میں بھی حافظ صاحبؒ نے ترجمہ قرآن کی تدریس کا یہی انداز جاری رکھا۔ حافظ صاحبؒ کا کہنا تھا کہ یہ تجربہ غالباً صرف قرآن اکیڈمی ہی میں کیا گیا ہے' ورنہ عربی جاننے والوں میں سے بھی بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جنہوں نے کبھی پورے قرآن کریم کا مطالعہ لغات و اعراب کے ساتھ کیا ہو' اور اس میں یونیورسٹی اور درسِ نظامی کے فاضلین کا حال یکساں ہے۔ میں نے جب ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے دورۂ ترجمہ قرآن کو مدوّن کر کے تفسیر ''بیان القرآن'' کی صورت میں ڈھالنے کا کام کیا تو لغات و اعراب قرآن کے حوالے سے حافظ صاحبؒ سے پڑھے ہوئے ترجمہ قرآن نے میری بہت راہنمائی کی۔

حافظ صاحبؒ نے اپنی تالیف ''لغات و اعرابِ قرآن کی روشنی میں ترجمہ قرآن کی لغوی اور نحوی بنیادیں'' کے مقدمہ میں لکھا ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ یہی دو امور ''لغات و اعراب'' ہی ترجمہ قرآن یا براہِ راست فہمِ قرآن کی بنیاد اور جان ہیں۔ اس کے ذریعے ہی:
>
> ۱) یہ پتہ چل سکتا ہے کہ کس مترجم نے کن لُغوی معنوں کو ترجیح دی ہے۔
>
> ۲) یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کس مترجم نے ترکیب نحوی میں کس چیز کو ملحوظ رکھا ہے۔
>
> ۳) اس بات کی نشان دہی ممکن ہے کہ کسی مترجم نے کہاں اور کس نوعیت کی غلطی کی ہے۔ اس غلطی کا معمولی یا سنگین ہونا' اور دانستہ یا نادانستہ ہونا ایک اضافی بات ہے۔
>
> ۴) کسی مترجم کے الفاظِ ترجمہ کے انتخاب میں غلطی یا درستی سامنے آتی ہے۔ پھر یہ کہ خوب اور خوب تر کا فرق بھی واضح اور نمایاں ہو جاتا ہے۔''

چنانچہ ترجمہ قرآن کی تدریس کے دوران طلبہ مختلف اردو تراجم سامنے رکھتے اور ساتھ ساتھ ان کا تقابلی مطالعہ بھی کیا جاتا۔ جس ترجمہ میں ان لغوی اور نحوی بنیادوں سے انحراف پایا جاتا' اس پر حافظ صاحبؒ گرفت فرماتے۔ اس ضمن میں غلام احمد پرویز کا ترجمہ خاص طور پر زیرِ عتاب رہتا۔ بعض اوقات تو حافظ صاحبؒ اس کی علمی خیانت پر قہقہہ بھی لگاتے (اور کبھی کبھی حسبِ حال پنجابی کا کوئی لطیفہ بھی سنا دیتے)۔

قرآن اکیڈمی میں ترجمہ قرآن کی اس تدریس سے ہی حافظ صاحبؒ نے ایک کتاب لکھنے کا ارادہ فرمایا جس میں ''لغات و اعرابِ قرآن'' کی روشنی میں ''ترجمہ قرآن کی لغوی اور نحوی بنیادیں'' واضح کرنے کے لیے کلاس میں کیے گیے اجمالی کام کی تفصیل آجائے۔ چنانچہ ۱۹۸۸ء میں انہوں نے ''لغات و اعرابِ قرآن'' کے مباحث بڑی تفصیل سے تحریر کرنے شروع کیے اور ان کے ساتھ ''الرسم'' اور ''الضبط'' کا اضافہ فرمایا۔ قرآنی الفاظ کے رسمِ املائی اور رسمِ عثمانی کا فرق واضح کیا۔ دنیا بھر میں قرآنی مصاحف میں ضبط یعنی حرکات لگانے کے جو مختلف انداز

اپنائے جاتے ہیں‘ ان کا فرق بھی دکھایا۔ حافظ صاحبؒ کی ذاتی لائبریری میں دنیا کے مختلف ممالک میں شائع ہونے والے قرآنی مصاحف موجود تھے اور وہ ان میں ضبط کا فرق واضح کرنے کے لیے مختلف مصاحف میں سے الفاظ نقل کرتے تھے۔

ماہنامہ ’’حکمت قرآن‘‘ میں ان گراں قدر مباحث کی اشاعت کا آغاز جنوری ۱۹۸۹ء کے شمارے سے ہوا۔ جریدے کا معاون مدیر ہونے کی حیثیت سے مجھے اس سلسلۂ مباحث کی کتابت‘ پروف خوانی اور تصحیح کے تمام تر کام کی نگرانی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ حافظ صاحب محترم نے اپنی علالت کے باعث جب قرآن اکیڈمی میں تدریس سے معذرت کر لی تب بھی گھر پر ’’لغات واعراب قرآن‘‘ کی تالیف کا کام جاری رکھا‘ لیکن اپنی حیاتِ مستعار میں اس گراں مایہ سلسلہ کو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۱۰ تک ہی پہنچا پائے۔ ماہنامہ ’’حکمت قرآن‘‘ میں اس سلسلۂ مباحث کی آخری قسط جولائی ۱۹۹۸ء میں شائع ہوئی۔ گویا اللغۃ‘ الاعراب‘ الرسم اور الضبط کے مباحث پر مشتمل یہ انمول سلسلۂ تالیف مسلسل دس برس تک ماہنامہ ’’حکمت قرآن‘‘ کے صفحات کی زینت بنتا رہا۔

حافظ صاحبؒ کے فرزند ارجمند جناب ڈاکٹر نعم العبد نے کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد اس بے مثل قرآنی خدمت کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لغات واعرابِ قرآن پر حافظ صاحب رحمہ اللہ نے جس علمی انداز میں یہ کام کیا ہے اس کی مثال اردو زبان تو کجا خود عربی میں بھی موجود نہیں ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین○○

(اتوار ۲۲ دسمبر ۲۰۲۴ء کو کتاب کی تعارفی نشست منعقدہ قرآن آڈیٹوریم لاہور میں پڑھا گیا۔)

❀❀❀

(۲)

نام کتاب : علم اور اہلِ علم

تالیف : مولانا حافظ محمد طاہر حافظ بشیر (سعودی عرب)

ترجمہ وترتیب : مولانا محمد شفیق الرحمٰن علوی (اُستاد جامعہ علوم اسلامیہ‘ بنوری ٹاؤن‘ کراچی)

طابع : مکتبہ علوی‘ کراچی رابطہ نمبر: 0335-2102186

اللہ تعالیٰ نے علم کی بنیاد پر ہی نوعِ انسانی کو اپنی تمام مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے موقع پر علم الاشیاء کی بنیاد پر ہی آپؑ تمام مخلوقات پر افضل ٹھہرے اور فرشتوں کے سجدے کے حق دار ہوئے۔ گویا انسان حقیقتاً اشرف المخلوقات تبھی ٹھہرتا ہے جب وہ صاحبِ علم ہو اور علم کے مقام ومرتبہ کو سمجھتا ہو۔ چنانچہ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ؕ﴾ (الزمر: ۹) ’’(اے

نبی ﷺ!) فرما دیجیے: کیا جاننے والے (علم رکھنے والے) اور نہ جانے والے (علم نہ رکھنے والے) برابر ہو سکتے ہیں؟'' ایک حدیثِ نبویؐ کے مطابق: ((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰی كُلِّ مُسْلِمٍ)) علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے۔ حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے: ((اَلْعِلْمُ نُوْرٌ)) یعنی علم روشنی (نور) ہے۔ یہ علم ہی کی روشنی ہوتی ہے جو جہالت کی تاریکیوں کو دور کر دیتی ہے اور پھر منزل واضح ہونے لگتی ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص حقیقی علم سے دور اور جہالت میں غرق ہے تو وہ انسان تو کیا' حیوانوں سے بھی بدتر ہے۔

اصل عربی کتاب ''طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ'' کی چودہ فصلیں ہیں اور ہر فصل میں متعلقہ موضوع پر آیات و احادیث جمع کی گئی ہیں۔ یہ ساڑھے تین سو صفحات پر محیط ہے۔ مترجم نے طوالت سے بچنے کے لیے تکرار اور تشریح کو حذف کر کے منتخب آیات و احادیث کا ترجمہ کیا ہے۔ گویا ایک طرح سے یہ اصل کتاب کا خلاصہ ہے۔ قارئین کی سہولت کے لیے ہر آیت و حدیث کو عنوان بھی دے دیا گیا ہے۔ اس میں سے کچھ جواہر ریزے آپ بھی ملاحظہ کریں:

نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے والوں کے لیے سورۃ الروم میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۲۹﴾

''مگر جو لوگ ظالم ہیں' بے سمجھے اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں۔ تو جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟ اور ان (جیسے لوگوں) کا کوئی مددگار نہیں۔''

حق کی پہچان اہلِ علم ہی کر سکتے ہیں۔ سورۂ سبا میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۶﴾

''اور (تاکہ) دیکھ لیں وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ہے کہ جو کچھ آپ کی جانب آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے' وہ (سراسر) حق ہے' اور وہ راہنمائی کرتا ہے نہایت غالب' لائقِ حمد و ثنا ہستی کے راستے کی طرف۔''

قرآن و سنّت کی پیروی ہی گمراہی سے بچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝۱۲۳﴾

''تو جو شخص میری ہدایت (قرآن) کی پیروی کرے گا' وہ نہ گمراہ ہو گا اور نہ ہی تکلیف میں پڑے گا۔''

قرآن کی اہم صفات کے حوالے سے بیہقی میں فرمانِ نبویؐ ہے:

((اَلْقُرْآنُ هُوَ النُّوْرُ الْمُبِيْنُ وَالذِّكْرُ الْحَكِيْمُ وَالصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ))

''قرآن تو واضح روشنی ہے' اور حکمت بھرا ذکر ہے' اور سیدھا راستہ ہے۔''

اسی طرح ترمذی میں حدیثِ رسولؐ ہے:

((اِنَّمَا اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِي الْاَئِمَّةَ الْمُضِلِّيْنَ، وَلَاتَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِيْ عَلَى الْحَقِّ

ظَاهِرِیْنَ لَا یَضُرُّھُمْ مَنْ خَذَلَھُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰہِ))

''مَیں اپنی اُمّت پر گمراہ کن اماموں (حُکّام یا علماء) سے ڈرتا ہوں' اور میری اُمّت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم اور غالب رہے گی' ان کی مدد نہ کرنے والے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے' یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قیامت) آ جائے۔''

موطا امام مالک میں حدیثِ نبویؐ ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا: کِتَابَ اللّٰہِ وَسُنَّۃَ رَسُوْلِہٖ))

''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' اگر تم انہیں مضبوطی سے پکڑے رکھو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے: اللہ کی کتاب اور اُس کے نبی کی سُنّت۔''

((مَنْ کَانَ فِیْ طَلَبِ الْعِلْمِ کَانَتِ الْجَنَّۃُ فِیْ طَلَبِہٖ وَمَنْ کَانَ فِیْ طَلَبِ الْمَعْصِیَۃِ کَانَتِ النَّارُ فِیْ طَلَبِہٖ)) (کنزالعمال)

''جو شخص علم کی طلب میں مشغول رہتا ہے' جنت اس کی تلاش میں رہتی ہے اور جو شخص گناہ کی طلب میں مشغول رہتا ہے' جہنم اس کی تلاش میں رہتی ہے۔''

((وَالْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ))

''اور علماء' انبیاء کے وارث ہیں۔''

((وَالْقُرْآنُ حُجَّۃٌ لَکَ اَوْ عَلَیْکَ))

''قرآن' تمہارے حق میں حجت ہے یا تمہارے خلاف حجت ہے۔''

((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ)) (صحیح البخاری)

''تم میں بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔''

((وَمَن سَلَّمَ عَلٰی صَاحِبِ بِدْعَۃٍ اَوْ لقیہ بِالبشر وَاسْتقبلہ بِمَا یسرہ فَقَدِ اسْتَخَفَّ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ)) (المصنف لابن ابی شیبہ)

''اور جس نے کسی بدعتی کو سلام کیا یا اس سے خندہ پیشانی سے ملاقات کی اور اس کا اس طرح استقبال کیا جس سے وہ خوش ہو گیا تو اس نے (گویا) محمد (ﷺ) پر نازل ہونے والی وحی کو حقیر سمجھا۔''

یہ کتاب کسی بھی لائبریری کی قدر و منزلت میں بنیادی کردار ادا کرے گی۔ ہر مسلمان کو اسے ضرور پڑھنا چاہیے کہ وہ اس سے نفع اٹھانے کا حق دار بن جائے۔ احباب کو تحفہ میں دینے کے لیے بہترین شے ہے۔ کتاب مجلّد ہے۔ عمدہ کوالٹی کے کاغذ کا انتخاب کیا گیا ہے۔

(تبصرہ نگار: پروفیسر حافظ قاسم رضوان)

(۳)

نام کتاب : شیخ الحدیث مولانا عبدالقیوم حقانی حفظہ اللہ: حیات وخدمات (۲ جلد)

تالیف وترتیب : مولانا عمادالدین محمود

صفحات : قریباً 1400' قیمت: درج نہیں

ناشر : مؤتمر المصنفین' جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے علمی ودینی مجلہ ماہنامہ ''الحق'' کی اشاعت خصوصی بعنوان ''شیخ الحدیث مولانا عبدالقیوم حقانی حفظہ اللہ حیات وخدمات'' دوضخیم جلدوں میں طبع ہوئی ہے اوراس وقت میرے زیرنظر ہے۔ اس میں مولانا عبدالقیوم حقانی حفظہ اللہ کی حیات اوران کی عظیم خدمات کو بڑے ہی دلچسپ اورحسین پیرائے میں سمویا گیا ہے۔ قاری کی دلچسپی اورتجسس من اولہ الی آخرہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ مولانا اپنی ذات میں ایک انجمن یا یوں کہیں کہ ایک اکیڈمی ہیں۔ آپ کی زندگی کے مختلف پہلو ہیں جنہیں ان ضخیم جلدوں میں سمویا گیا ہے۔ یہ ایک فرد کی سوانح عمری ہے جوکہ خود اس کی حیات میں طبع ہوگئی ہے۔ ورنہ ہماری ریت تو یہ رہی کہ زندوں کی زندگی میں قدر نہیں کرتے' ہاں وفات پاجانے کے بعد ضروران کے کارناموں کے قصیدے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔

کتاب کو پندرہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

باب ۱: پیدائش' خاندانی حالات' ابتدائی تعلیم وتربیت

باب ۲: بچپن کی یادیں' تحصیل وتکمیل علم **باب ۳:** اساتذہ کرام

باب ۴: آغاز تدریس' محدثانہ خدمات کتبِ حدیث کی شروحات ومطبوعات

باب ۵: ذوق مطالعہ' تصنیف وتالیف **باب ۶:** جامعہ ابوہریرہ

باب ۷: مواعظ وخطبات **باب ۸:** ذوق شعروادب

باب ۹: تعلق بالقرآن' تصوف وسلوک **باب ۱۰:** شخصیت وکردار

باب ۱۱: عقیدتوں کا سفر **باب ۱۲:** جہاد افغانستان میں مجاہدانہ کردار

باب ۱۳: مکتوبات حقانی **باب ۱۴:** اکابر کی نظر میں

باب: خوان یغما

اس اشاعت خصوصی کے بارے میں رسالہ کے مدیر اعلیٰ مولانا راشد الحق سمیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب مدظلہم کے علمی' ادبی' تصنیفی اور تخلیقی کارناموں کی دنیا معترف ہے اور دین کے ہر شعبہ میں آپ کی مساعی جمیلہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ راقم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے استاد

جی کو دادا جانؒ اور ابا جان شہیدؒ کے مقرب‘ قریب اور خدمت کرتے دیکھا۔ آپ کی ہر تحریر‘ ہر تقریر اور ہر مجلس میں دار العلوم حقانیہ‘ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ اور مولانا سمیع الحق شہیدؒ کا ذکر خیر ضرور ہوتا ہے۔ یہ اشاعت خصوصی درحقیقت اپنے محسن کو خراج عقیدت پیش کرنے کی ایک ادنیٰ سی کاوش ہے۔ امید ہے یہ کتاب علماء‘ طلبہ اور عامۃ الناس کے لیے ایک لائحۂ عمل اور شخصیت و کردار کا مظہر ثابت ہوگی۔‘‘

مولانا انوار الحق صاحب بن مولانا شیخ الحدیث عبدالحقؒ تحریر فرماتے ہیں:

’’آپ کی خوبیوں کی بنا پر والدی الکریمؒ اور برادر مکرمؒ نے آپ کا جامعہ حقانیہ میں بحیثیت مدرّس و مصنف تقرر فرمایا کہ وہ اس قطرہ کو مستقبل میں شناس نگاہوں سے گہر ہوتے دیکھ رہے تھے۔ مجھے بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جامعہ حقانیہ کا ترجمان اور مادرِ علمی کی زبان بنا دیا ہے۔‘‘

مولانا عبدالقیوم حقانی اپنے اساتذہ کرام اور شیوخ کے بارے میں کچھ اس طرح فرماتے ہیں:

’’ہمارے حقانی شیوخ کے اندر بے شمار کمالات تھے۔ اخلاق‘ تواضع‘ اور سادگی ان کے جبلی اوصاف تھے۔ اپنے کام‘ ذمہ داریوں اور فرائض کی ادائیگی کے لیے بے حد حساس لگتے تھے۔ ہر کام کو اپنے وقت پر انجام دینا انہیں بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ صرف کتاب نہیں فن پڑھاتے تھے۔ وہ مدرسہ کی زندگی کو تمام مشاغل سے مقدم رکھ کر اپنا فریضہ نبھاتے تھے۔ طلبہ کے علمی نقصان کا خوف انہیں سیاسی ہنگاموں سے دور رکھتا تھا۔ ان کی ذاتی زندگی بھی انفاسِ قدسی کا مرکب تھی۔ علم شریعت کے ساتھ ساتھ تصوف و طریقت سے بھی حظ وافر حاصل تھا۔ ان شخصیات کے مثبت پہلو کو دیکھ کر یہ شعر یاد آتا ہے ؎

کبھی چاند ہے کبھی پھول ہے‘ کبھی رنگ‘ کبھی نور ہے
یہ پتہ ہے ایک ہی شخص کا کسی نام سے بھی بلائیں ہم‘‘

اپنے شیخ حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ کے سراپے کی کچھ اس طرح منظر کشی کرتے ہیں:

’’باوقار سراپا‘ مجسم متانت اور پیکر شرافت‘ لباس انتہائی صاف ستھرا‘ سر پر عمامہ‘ نہایت سفید اور صاف‘ آنکھوں میں ایمان کا نور‘ چہرے پر علم و ذہانت کا اجالا دمکتا نظر آتا تھا۔‘‘

آپؒ کے اوصاف کو ان لفظوں سے تعبیر کرتے ہیں:

’’معمولات کی پابندی و مشغولی‘ مطالعہ کتب‘ فکر و مراقبہ‘ تہجد و مناجات اور ریاضت شبانہ کے باوجود دن میں بڑی مستعدی‘ بیداری‘ ہر ایک کی طرف حسبِ حال پوری توجہ و التفات‘ اضیاف کی کثرت اور ان کا اکرام۔ درس و تدریس میں حیرت انگیز مباحث‘ اور علمی نکات اس شان سے بیان فرماتے کہ تھکاوٹ یا اکتاہٹ کا کوئی شائبہ بھی معلوم نہ ہوتا۔‘‘

مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب اپنے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

’’میں نے جامعہ حقانیہ میں درس و تدریس کے دوران جامعہ کو اپنا گھر سمجھا‘ مدرسہ کی ہر چیز کی حفاظت کو عبادت کا درجہ دیا‘ شیخؒ کی ہر ممکنہ خدمت کو سعادتِ دارین سمجھ کر انجام دیتا رہا۔ ان کے اشارۂ ابرو کو حکم کا درجہ دیتا رہا‘ ان کے حکم‘ مشورے اور اجازت کے بغیر کام کرنا میرے نزدیک گناہ کبیرہ سے کم نہ تھا۔‘‘

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کے دل ودماغ کو علوم دینیہ کے لیے کھول دیا ہے جس کی واضح مثال یہ ہے کہ آپ نے حدیث کی مشہور کتاب صحیح مسلم شریف کی سہل ترین' دلنشین تشریح ۲۳ جلدوں میں ''شرح صحیح مسلم'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس ضخیم کتاب کے بارے میں شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس بحرِ عمیق میں داخل ہونے کی تو بندہ میں صلاحیت نہ تھی لیکن مختصراً ورق گردانی کی سعادت نصیب ہوئی اور بے ساختہ یہ مصرعہ خیال میں آیا ''ایں کار از تو آید ومرداں چنیں کنند۔'' دل سے دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کی اس عظیم کاوش کو شرف قبول عطا فرما کر نافع بنائیں اور یہ مفید خاص وعام ہو (آمین)۔''

مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کی دوسری تالیف ''حقائق السنن'' کے بارے میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم تحریر فرماتے ہیں:

> ''ماشاء اللہ آپ کی تصنیف ''حقائق السنن'' آپ کی جہود مبارکہ کا ثمرۂ طیبہ بن کر سامنے آچکی ہے۔ احقر اس سے استفادہ کر رہا ہے۔ اس کا ذکر خیر ''البلاغ'' میں بھی کر دیا ہے۔ ماشاء اللہ آپ کا علمی ذوق حضرت شیخ الحدیث کی سرپرستی اور مولانا سمیع الحق صاحب کی نگرانی کام کے حسن کی ضمانت ہے۔''

مولانا کی اب تک قریباً اسّی (۸۰) کتب طبع ہو کر آچکی ہیں۔

مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب نے اپنے آپ کو جس طرح اپنے شیخؒ اور اکابرین حقانیہ کے مزاج و مذاق میں ڈھالنے کے لیے جتنے جتن کیے ہیں وہ آج کے طالب علموں کے لیے روشن مینار ہیں۔ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب قطرہ سمندر میں غرق ہوتا ہے تو سمندر بن جاتا ہے اور ریت کا ذرہ جب صحرا میں دفن ہو جاتا ہے تو صحرا بن جاتا ہے۔ یہی کچھ مولانا حقانی صاحب کے ساتھ ہوا ہے کہ وہ اور اکابرین حقانیہ و جامعہ حقانیہ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں یا یہ کہیں کہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

کتاب کی طباعت و بائنڈنگ وغیرہ عمدہ ہے۔ ہاں کہیں کہیں پروف ریڈنگ کی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اس طرح تذکیر و تانیث کی بھی بعض جگہ غلطیاں ہیں۔ دلی دُعا ہے کہ یہ کتاب نافع خلائق ہو۔ خصوصاً مدارسِ عربیہ کے طلبہ کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے تاکہ ان میں بھی جذبہ محرکہ پیدا ہو۔ (آمین!)

(تبصرہ نگار: مولانا شیخ رحیم الدین)

❁❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr.Israr Ahmad

Surah Al-Anfāl (8)

Ayāt 45 to 48

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَۚ﴿۴۵﴾ وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ
وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَۚ﴿۴۶﴾ وَ لَا تَكُوْنُوْا
كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ
مُحِيْطٌ﴿۴۷﴾ وَ اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَ قَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ
فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ
وَ اللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴿۴۸﴾

Ayah 45

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا

O believers! When you face an enemy, stand firm

This was a period when fierce conflict between truth and falsehood had commenced, and thus, the struggle for the supremacy of the Deen had entered its final phase. The Battle of Badr was the first engagement in this connection, with many more battles yet to be fought. Therefore, in these ayāt, the Muslims are being provided with essential directions regarding their conduct in the battlefield and their combat strategies to enable them to navigate the circumstances successfully. The first instruction in this regard is that whenever you face an army on the battlefield, you should stand firm and never, under any circumstances, run away from the enemy.

وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾

And remember Allah often so you may triumph.

The second directive is to remember Allah abundantly, even in the midst of battle, because your actual strength depends on the assistance of Allah. And Allah's help is with those who are patient and steadfast: ﴿ وَ اصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ ﴾ (An-Nahl 127) "And be patient. Your patience is not but through Allah." Remember that the patience of a believer is only possible through reliance upon Allah. Therefore, if your hearts are illuminated with the remembrance of Allah and you have a strong spiritual and emotional bond with Him, you will find the support needed to remain steadfast. However, if your connection with Allah weakens, your courage will falter as well.

Ayah 46

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

Obey Allah and His Messenger

This third command pertains to maintaining discipline: whatever directive you receive from the Messenger of Allah ﷺ, adhere to it with utmost dedication. Although the obedience of both Allah and His Messenger ﷺ has been mentioned here, it is, in reality and practical implication, an instruction to obey the Messenger ﷺ, because every command that came the way of the Muslims came through him. The Quran itself was articulated by the Prophet ﷺ, and even if he came to a decision through his own ijtihād (reasoning), it was still delivered through his verbalization. Therefore, in practice, obedience to Allah is intrinsically linked to obedience to the Prophet ﷺ. This notion has been encapsulated in a single line by Iqbal in an exquisitely eloquent way:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!

"Attach thyself to Mustafa ﷺ, for all religion is but him."

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾

And do not dispute with one another, or you would be discouraged and weakened. Persevere! Surely Allah is with those who persevere.

While contemplating this ayah, one must keep in mind the theme of Surah Āl-Imran, ayah 152. There, reflecting on the events of the Battle of Uhud, Allah has stated: ﴿ وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَ عَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

﴿وَمَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾ "And Allah fulfilled His promise to you when you were killing them by His permission. Until when you lost courage and fell into dispute over the order and disobeyed after He showed you what you loved." Allah, being fully aware of the situation that would unfold a year later at the Battle of Uhud, provided Muslims with clear instructions concerning military strategy well in advance, sternly warning them: "Beware! Never be lax in maintaining discipline and obeying the Messenger ﷺ, or you will suffer grave losses."

Ayah 47

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ

Do not be like those [pagans] who left their homes arrogantly, only to be seen by people

This refers to the army of the Quraysh. When this army departed from Makkah, its grandeur and might were truly intimidating. This was the reason why Abu Jahl and the other leaders of the Quraysh, driven by their pride and haughtiness, were convinced that a handful of Muslims would prove to be mere chaff against their powerful army and that they would effortlessly crush them.

وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٤٧﴾

And to hinder others from Allah's Path. And Allah is Fully Aware of what they do.

They were dedicating all their efforts and energies to obstructing Allah's creation from His path, yet none of their scheming could escape Allah's power.

Ayah 48

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ

And [remember] when Satan made their [evil] deeds appealing to them, and said, "No one can overcome you today."

Satan had instilled arrogant thoughts in their hearts, leading them to a false sense of security: "Your preparations, your weapons, and your vast army represent an extraordinary and unprecedented situation. There is no precedent in Arab history for an army like this. Who has the courage to stand before this army today, and who possesses the strength to overcome you?"

وَاِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ

"I am surely by your side."

فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَيْهِ

But when the two forces faced off, he cowered

وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ

And said, "I have absolutely nothing to do with you. I certainly see what you do not see."

Since Iblis (Azazil) was created from fire, he was able to perceive the angels descending and fled in retreat, declaring, "I see what you do not see."

اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝٤٨

"I truly fear Allah, for Allah is severe in punishment."

Ayāt 49 to 58

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝٤٩ وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ يَتَوَفَّی الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ
وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝٥٠ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝٥١ كَدَاْبِ اٰلِ
فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ۝٥٢ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ
اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝٥٣ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ
بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝٥٤ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٥٥ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝٥٦
فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝٥٧ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ
خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۝٥٨

Ayah 49

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ

[Remember] when the hypocrites and those with sickness in their hearts said

Up till now, one side's state of affairs has been depicted: the departure of the army of the Quraysh from Makkah, the condition of that army, the

arrogant thoughts of its leaders, the encouragement from Satan, and his retreat at the critical moment are all aspects that have been highlighted. Now, this ayah reflects upon the situation in Madinah: when the Messenger of Allah ﷺ left from Madinah with the army, the hypocrites who remained behind were coming up with various remarks. They were saying:

غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيۡنُهُمۡ ؕ

"These [believers] are deluded by their faith."

They must have completely lost their minds to have set out to confront such a formidable army. We already regarded them as foolish, but now we have practically observed that they have been driven to total madness by their faith.

وَمَنۡ يَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۴۹﴾

But whoever puts their trust in Allah, surely Allah is Almighty, All-Wise.

<u>**Ayah 50**</u>

وَلَوۡ تَرٰٓى اِذۡ يَتَوَفَّى الَّذِيۡنَ كَفَرُوا ۙ الۡمَلٰٓـئِكَةُ

If only you could see when the angels take the souls of the disbelievers

يَضۡرِبُوۡنَ وُجُوۡهَهُمۡ وَاَدۡبَارَهُمۡ ۚ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ ﴿۵۰﴾

Beating their faces and backs, [saying,] "Taste the torment of burning!"

<u>**Ayah 51**</u>

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ﴿۵۱﴾ۙ

This is [the reward] for what your hands have done. And Allah is never unjust to [His] creation."

<u>**Ayah 52**</u>

كَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ

Their fate is that of the people of Pharaoh and those before them.

Prior to the family of Pharaoh, there were the people of Shu`ayb عليه السلام, and before them, the people of Lūt عليه السلام, preceded by the Thamud and the `Ād, and before them, the people of Nūh عليه السلام. We have already read about the fates of all these nations in Surah Al-A`rāf.

كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ

They all disbelieved in Allah's signs, so Allah seized them for their sins.

اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

Indeed, Allah is All-Powerful, severe in punishment.

Ayah 53

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ

This is because Allah would never discontinue His favour to a people until they discontinue their faith.

Allah has sent a messenger of His to every nation. Every messenger called his nation to the oneness of Allah and preached them according to His commandments. Those who responded to the call were blessed with Allah's favors, and showers of His bounties descended upon them. However, after their messenger departed, they gradually adopted disbelief and misguidedness, abandoning the boulevard of monotheism for the alleys of polytheism. Consequently, Allah's blessings turned away from them and were replaced by His punishment, which led to the annihilation of the nation.

A nation came into being from the progeny of the believers who boarded the Ark of Nūh علیہ السلام. When that nation went astray, Hūd علیہ السلام was sent to them. Then, from the descendants of those who believed in Hūd علیہ السلام, the Thamud emerged. When they too went astray, Saleh علیہ السلام was appointed as a messenger for them. Thus, every nation faced ruin for abandoning the path of their prophet, yet Allah did not take His favor from any nation until they themselves forsook the path of guidance for error. This theme will reappear later in Surah Ar-R`ad (ayah 11). Maulana Zafar Ali Khan has expressed this theme in a beautiful couplet in these words:

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!

"God has never changed the state of a nation,
That does not consider changing its own state of affairs."

According to this philosophy, when a nation adopts hard work as its principle, positive changes manifest in its external circumstances, and thus

its destiny transforms. Merely harboring wishful thoughts and relying solely on prayers does not alter the fates of nations. Since a nation is a collection of individuals, the change must begin with the individuals themselves. Initially, a select few undergo a transformation; their thoughts, their ideologies, their aspirations, and their interests shift. As the number of such pure-hearted individuals gradually increases, they organize themselves into a formidable force, standing as an unyielding wall against falsehood. In this way, the storms of tyranny are compelled to change their course. Through the sacrifices of those who uphold the truth, systems are altered, the dawn of revolution breaks forth, and society is once again set upon the path of righteousness.

However, it is essential to recognize that for this struggle for revolution, our intellectual and practical guidance must come solely from the teachings of the Quran. It is this education that brings about a revolution in the depths of one's soul. It is this elixir that metamorphoses one to the extent that this heap of dust instantaneously transforms into an inexorable sword. Allama Iqbal has expounded upon this subtle point as follows:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

"When it permeates the soul, the soul transforms anew,
As the soul is renewed, the world changes too."

When the Quran penetrates an individual's heart, it completely alters his heart and soul. This transformation in the inner realm of a believer ultimately manifests itself as a global revolution.

وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٥٣﴾

Surely Allah is All-Hearing, All-Knowing.

<u>Ayah 54</u>

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ

That was the case with Pharaoh's people and those before them.

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ

They all rejected the signs of their Lord, so We destroyed them for their sins

وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿٥٤﴾

And drowned Pharaoh's people. They were all wrongdoers.

Ayah 55

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

Indeed, the worst of all beings in the sight of Allah are those who persist in disbelief, never to have faith.

This notion has been established earlier in Surah Al-A`rāf, ayah 179, where it was stated that such individuals outwardly appear to be human, yet in reality, they are not: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ﴾ ''They have hearts with which they do not understand, and they have eyes with which they do not see, and they have ears with which they do not hear. Those are like livestock; rather, they are more astray. '' Here, these individuals have been described as "شَرَّ الدَّوَآبِّ" (the worst of creatures): they are those animal-like humans who are worse than beasts, having succumbed to the fleeting pleasures of this world by choosing disbelief over the blessings of faith.

Ayah 56

اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّ هُمْ لَا يَتَّقُوْنَ

[Namely] those with whom you [O Prophet] have entered into treaties, but they violate them every time, not fearing the consequences.

This refers to the Jews of Madinah. When the Messenger of Allah ﷺ arrived in Madinah, he immediately initiated negotiations with the Jews, which resulted in an agreement for the mutual defense of the city with the three Jewish tribes of Madinah. Professor Montgomery Watt (1909–2006), celebrating the astuteness and political insight of the Prophet ﷺ in splendid accolades, has hailed this agreement as a momentous diplomatic achievement of his. Although the Jews appeared to adhere to the covenant, they kept secretly engaging in intrigues against the Muslims. At every challenging juncture, they failed to uphold their commitments and conspired with the enemies of the Prophet ﷺ. Even at the most critical moment of the Battle of the Confederates (Ghazwa al-Ahzāb), they covertly sent messages to the Quraysh, urging them to attack the city and ensuring them that they would provide assistance from the inside.

Ayah 57

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ

If you ever encounter them in battle, make a fearsome example of them, so perhaps those who would follow them may be deterred.

These Jews keep conspiring secretly with the disbelievers of Makkah against you. However, if some of them are captured in the battlefield while fighting on behalf of the Quraysh, inflict upon them such a punitive example that even the Quraysh, who are pulling their strings in the background and plotting these conspiracies, may come to their senses.

Ayah 58

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ

And if you [O Prophet] see signs of betrayal by a people, respond by openly terminating your treaty with them.

In the preceding ayāt, the violation of the treaty was discussed as an individual act. For instance, if a member of a tribe is found to be involved in such a conspiracy, it is possible for the individuals or leaders of that tribe to absolve themselves by claiming that it was merely the personal act of that individual, while collectively, their tribe remains bound to the agreement. However, this ayah addresses the issue at a national level with the instruction: "O Prophet ﷺ! If you fear that a nation or tribe may breach the treaty, you should abrogate the agreement in an overt manner." This is because the moral standard that Allah desires to see the believers adhere to makes it impossible for a treaty to outwardly exist while inwardly there are plans to act against the concerned party. Therefore, the Prophet ﷺ was commanded that should such a situation arise, you must openly declare that from this day forward, there is no agreement between you and me.

Maulana Maududi رحمه الله expressed his views regarding the Jihad of Kashmir in 1948 in light of this Quranic directive, stating that taking such action while diplomatic relations with India existed was contrary to the teachings of the Quran and the Shari`ah, and such a policy was unbefitting of a government representing a state established in the name of Islam. He held the view that Pakistan should, placing its trust in Allah, openly declare its policy. Striking deals for mutual cooperation and extending friendship in public while sabotaging each other secretly may be typical of those focused on the world, but it is not the path of the faithful. Although Maulana Maududi's رحمه الله opinion was perfectly in line with the spirit of this ayah, it stirred considerable agitation among the public at that time.

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

Surely Allah does not like those who betray.

Ayāt 59 to 66

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ
رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ
وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ
لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ
الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ
بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ
يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾
اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ
وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

<u>Ayah 59</u>

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ

Do not let those disbelievers think they are not within reach.

This refers to those among the one thousand fighters in the disbelievers' camp who managed to escape unscathed during the Battle of Badr. They are being cautioned against the delusion that they have truly evaded punishment.

اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾

They will have no escape.

They will not be able to evade His control.

<u>Ayah 60</u>

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ

Prepare against them what you 'believers' can of 'military' power and cavalry

Here, the Muslims are being commanded in unambiguous terms: "Now that your movement has entered the phase of confrontation, you must, according to your resources, prepare diligently for Jihad by mastering the

art of warfare to the utmost of your capacity, while at the same time securing weaponry, horses, and other paraphernalia. While a true believer should rely solely on Allah's assistance, this 'Tawakkul' (reliance) does not imply sitting idly and hoping that everything will happen on its own by Allah's help. The true essence of Tawakkul is to equip oneself with all possible material and technical resources, and then put one's trust in Allah's support.

This ayah strongly emphasizes the necessity for Muslims to strive to their fullest for acquiring maximum defensive capabilities against their enemies. This directive applies through all ages. Today, if Allah has granted Pakistan nuclear power, this capability is a symbol of the strength and power of the nation as well as a trust from the entire Muslim ummah. Any compromise in this regard, under any sort of pressure, would amount to a betrayal of Allah, His Deen, and the entire Muslim world. Therefore, it is of utmost importance for the Pakistani nation to remain vigilant against its adversaries and adopt a courageous policy that maintains a balance of deterrence against its enemies in the form of nuclear arms.

تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ

To deter Allah's enemies and your enemies

وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ

As well as other enemies unknown to you but known to Allah.

They are the insidious betrayers among you, the hypocrites, who secretly contrive schemes for your destruction. Although they may remain concealed from your view, Allah is fully aware of them.

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝٦٠

Whatever you spend in the cause of Allah will be paid to you in full and you will not be wronged.

This means that if you need to purchase weapons, provide equipment, or prepare mounts, there will naturally be expenses involved. Therefore, alongside the instruction for preparation for combat, the command for spending in the way of Allah has also been issued, accompanied by the guarantee that for whatever one spends in this cause, one will receive a reward commensurate to one's efforts, without any injustice. Here, it is essential to recall the directives concerning spending in the way of Allah as

mentioned in Surah Al-Baqarah, ayāt 36 and 37. The essence of the message here is: O Muslims! Your movement has now entered a stage where it has become imperative to prepare for war as thoroughly as possible and to acquire the best weaponry available. Therefore, step forward and spend generously for this noble cause. Allah has promised to reward you seven hundredfold for every unit spent, and even that is not the ultimate limit. The greater the spirit of altruism and sincerity, the more the reward will be multiplied. Thus, instead of hoarding your wealth, dedicate it to the path of Allah, so that it serves to establish the supremacy of His Deen in this world and secures your success in the Hereafter.

Ayah 61

وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا

If the enemy is inclined towards peace, make peace with them.

This instruction indicates that if the opposing party appears ready to initiate peace, you (O Prophet ﷺ) should also accept peace under appropriate conditions for the sake of safety and harmony.

وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۶۱﴾

And put your trust in Allah. Indeed, He 'alone' is the All-Hearing, All-Knowing.

This means that you should not be concerned about their negative machinations; instead, place your trust in Allah and respond to the offer of peace with a commitment to peace.

Ayah 62

وَاِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ فَاِنَّ حَسۡبَكَ اللّٰهُ ؕ

But if their intention is only to deceive you, then Allah is certainly sufficient for you.

Here, the Prophet ﷺ is being guaranteed Allah's support against their schemes and deceptions.

هُوَ الَّذِىۡۤ اَيَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۶۲﴾

He is the One Who has supported you with His help and with the believers.

Allah, by His special grace and favor, bestowed upon you (O Prophet) such sincere and devoted companions رضي الله عنهم that wherever your sweat fell,

they shed rivers of their own blood. The magnitude of this special assistance by Allah is particularly manifested when we compare the conduct of the companions of Muhammad ﷺ with that of the followers of Mūsa علیه السلام. When Mūsa علیه السلام urged his people to fight in the way of Allah, they responded plainly: ﴿فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا ھٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ﴾ (Al-Maidah 24) "(So go, you and your Lord, and fight. Indeed, we are sitting right here)." In response, Mūsa علیه السلام expressed his frustration saying: ﴿رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَ اَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ﴾ (Al-Maidah 25) "O my Lord, I have no control except for myself and my brother; so separate us from the disobedient people."

In contrast, observe the spirit of integrity and self-sacrifice exhibited by the companions of the Prophet ﷺ. Prior to the Battle of Badr, when the Prophet ﷺ consulted his companions رضي الله عنهم at Safrā (this was a highly contentious discussion), some individuals persistently argued that they should pursue the caravan. Their reasoning was indeed very sound and compelling. However, the Prophet ﷺ repeatedly asked for additional opinions from others. At this, from among the emigrants (Muhajirūn), Miqdad رضي الله عنه stood up and declared, "O Messenger of Allah! Wherever your Lord commands you to go, you should proceed in that direction. Do not consider us like the companions of Mūsa علیه السلام, who said: ﴿فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا ھٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ﴾. We are your companions; we are ready to follow whatever command you give." At this moment, Abu Bakr Siddiq رضي الله عنه and Umar رضي الله عنه also expressed their views, but the Prophet ﷺ sought to ascertain the opinions of the Ansār. This was because during the Second Pledge of `Aqabah, the Ansār had promised that if there were an attack on Madinah, they would protect the Prophet ﷺ. However, the situation now entailed engaging in battle outside of Madinah, and thus the decision to fight could not be made without consulting the Ansār. Sa'd bin Mu'adh رضي الله عنه understood the Prophet ﷺ's intention and stood up to say: "O Messenger of Allah! Perhaps your words are directed towards us, the Ansār." The Prophet ﷺ confirmed, "Yes!" Upon this, Sa'd رضي الله عنه continued, "Indeed, we have believed in you and affirmed your truth... We have come to accept you as the Messenger of Allah, and we have pledged to listen and obey. Therefore, we have no option but to comply with your commands. I swear by the One who has sent you with the truth, if you were to lead us into the sea, we would willingly follow you into it. By Allah, if you command us, we are going to reach Barak al-Ghamād (a city in Yemen), even if our camels become weak. We do not find it undesirable in any respect that you lead us into confrontation with the enemy

tomorrow. We will stand firm in the battlefield, exhibit true valor in the face of the enemy, and Allah might just let you witness from us something that soothes your eyes. So, relying upon Allah's blessings, please lead us forth." Upon hearing the words of Sa'd رضي الله عنه, the face of the Prophet ﷺ lit up with joy, and he issued the order to set out for Badr. This serves as a glimpse of the support that Allah had bestowed upon the Prophet ﷺ in the form of his extremely sincere and devout companions رضي الله عنهم.

Ayah 63

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ

He brought their hearts together. Had you spent all the riches in the earth, you could not have united their hearts.

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ

But Allah has united them.

In Surah Āl-Imran, ayah 103, Allah recalls this special grace with the following words: ﴿وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ "And remember Allah's favor upon you when you were enemies, and He brought your hearts together, and by His grace, you became brothers. And you were on the edge of a pit of fire, and He saved you from it."

اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝٦٣

Indeed, He is Almighty, All-Wise.

Ayah 64

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝٦٤

O Prophet! Allah is sufficient for you and so are the believers who follow you.

When read in conjunction with the previous ayah, the translation of this ayah is as indicated above. However, it can also be translated as: "O Prophet! Allah is sufficient for you and for those who follow you." The phrasing is such that it allows for both interpretations to coexist.

Ayah 65

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ

O Prophet! Motivate the believers to fight.

After the Hijrah, for nine years, motivation, encouragement, and urging remained the primary means of prompting the believers towards battle. Over time, this urging intensified into a fervent call. During the first period, the virtues of the Mujahidīn were highlighted, and promises of elevated ranks were made (An-Nisa 95). However, fighting was not mandated for everyone. Yet, in the ninth year of Hijrah, at the time of the Battle of Tabūk, it was made obligatory for all believers to partake in Jihad. It was an all-out call for all believers, and no one without a valid excuse was permitted to remain behind.

اِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ عِشۡرُوۡنَ صٰبِرُوۡنَ يَغۡلِبُوۡا مِائَتَيۡنِ ۚ

If there are twenty steadfast among you, they will overcome two hundred.

وَاِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ مِّائَةٌ يَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفًا مِّنَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا

And if there are one hundred of you, they will overcome one thousand of the disbelievers

بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ ۝٦٥

For they are a people who do not comprehend.

Here, the lack of understanding refers to their uncertainty regarding the truth of their position. On one side is the individual who possesses firm conviction in the truth of his ideology and believes that he is on the right path, fighting for what is just. On the other side is the one who is ideologically unstable; he may either be a hired mercenary or fighting under duress from another's command. Naturally, the performance of these two individuals will be worlds apart. Therefore, the disbelievers cannot attain the steadfastness and resilience in battle that arises from the spirit of sacrificing one's life for the truth of one's cause. It is upon this difference in ideological states between the two sides that the promise of the triumph of ten steadfast Muslims over a hundred disbelievers has been conveyed. The following ayah, although revealed some time later, has been included here due to the continuity of the theme.

Ayah 66

اَلۡـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنۡكُمۡ وَعَلِمَ اَنَّ فِيۡكُمۡ ضَعۡفًا ؕ

Now Allah has lightened your burden, for He knows that there is weakness in you.

Which weakness does this ayah point towards and how did this weakness arise? It is crucial to understand this point clearly. As far as the companions رضي الله عنهم among the Muhajirūn and Ansār who had embraced Islam early are concerned, they had no shortcomings whatsoever. However, the newer converts had not yet been trained in the same manner as the earlier ones, and faith had not yet become firmly established in their hearts. Moreover, it was a significant fact in its own right that the proportion of such new individuals was progressively increasing within the overall number of the Muslims. For instance, if there had been fifty or so newly converted individuals among a thousand Muslims previously, their number was now considerably larger. Consequently, on average, there was a decline in strength among the ranks of the Muslims compared to the past.

فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ

So if there are a hundred steadfast among you, they will overcome two hundred.

وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ

And if there be one thousand, they will overcome two thousand, by Allah's Will.

وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝٦٦

And Allah is with the steadfast.